Scanned by CamScanner

شاعر اور شاعری

(تنقیدی مقالات)

ڈاکٹر سیّد احمد قادری

زیر اہتمام

مکتبہ غوثیہ

۷۔نیو کریم گنج، گیا۔۸۲۳۰۰۱ (بہار)

rekhta

Scanned by CamScanner

© ڈاکٹر سید احمد قادری

نام کتاب	:	شاعر اور شاعری
ناشر و مصنف	:	ڈاکٹر سید احمد قادری
ای میل	:	dr_quadri54@yahoo.com
فون و موبائل	:	0631-2422818 / 9934839110
اشاعت اول	:	۲۰۰۷ء
تعداد	:	۵۰۰
قیمت	:	۱۵۰ روپے
کمپوزنگ	:	ابوالکلام عزیزی
مطبع	:	پاکیزہ آفسیٹ پریس، پٹنہ۔۶

زیر اهتمام

مکتبہ غوثیہ

۷۔نیو کریم گنج، گیا۔۸۲۳۰۰۱ (بہار)

SHAIR AUR SHAIREE by Dr. Syed Ahmad Quadri

(Criticism)

Year - 2007

Price - 150/-

ISBN : 819023

Published by

MAKTABA GHAUSIA

7-New Karim Ganj, Gaya-823001 (Bihar)

Scanned by CamScanner

انتساب

ان شاعروں کے نام

جن کی خدمات کا اعتراف ناقدوں نے نہیں کیا!

ڈاکٹر سید احمد قادری

rekhta

Scanned by CamScanner

ترتیب

ایک نظر شاعر اور شاعری پر ۳
✪ میر تقی میرؔ: کی شاعرانہ عظمت ۷
✪ مرزا غالبؔ: تجھے ہم ولی سمجھتے ۱۵
✪ علامہ اقبالؔ: کی عالمی مقبولیت ۲۴
✪ سیمابؔ اکبرآبادی: ایوانِ غزل کا منفرد شاعر ۳۲
✪ فراقؔ گورکھپوری: غزل کی آبرو ۳۹
✪ جمیلؔ مظہری: کی شاعرانہ شناخت ۴۹
✪ کیفیؔ اعظمی: انقلابی شاعر ۶۱
✪ سریرؔ کابری: محشرِ انقلاب کا شاعر ۷۳
✪ پرویزؔ شاہدی: ناقدوں کا مقتول شاعر ۸۱
✪ مظہرؔ امام: جدید اردو شاعری کا امام ۸۸
✪ فرحتؔ قادری: دورِ جدید کا میرؔ ۹۹
✪ علقمہؔ شبلی: بدلتے وقت کا شاعر ۱۱۲
✪ رمزؔ عظیم آبادی: کی شاعری ۱۱۸
✪ علیم اللہ حالیؔ: منفرد لب و لہجہ کا شاعر ۱۲۲
✪ منور رانا: سفاک عہد کا معصوم شاعر ۱۲۷
✪ ساجدہ زیدی: کی نظم نگاری ۱۴۱
✪ شاہدؔ جمیل: خوابوں کا شاعر ۱۴۶
✪ شہپرؔ رسول: عصرِ حاضر کا بے باک شاعر ۱۵۴

Scanned by CamScanner

ایک نظر شاعر اور شاعری پر

''شاعر اور شاعری'' میرے گزشتہ تنقیدی مقالات کے مجموعہ کی اشاعت کے تقریباً دس برسوں بعد منظر عام پر آرہا ہے۔

اس مجموعہ میں میرے وہ مقالات شامل ہیں جن میں وقتاً فوقتاً میں نے مختلف عہد کے بعض شعراء کی شاعری پر تنقیدی نگاہ ڈالی ہے۔

اردو شاعری نت نئے تجربات واحساسات سے گزرتی ہوئی، آج بھی افکار واظہار کی ایک مضبوط، مقبول اور لطیف صنفِ ادب ہے۔ شاعری میں فکری آگہی، فنی نزاکت، ندرتِ اسلوب اور الفاظ کے مزاج ومعنیٰ کے برتنے کی جو کارفرمائی ہوتی ہے اور معمولی موضوع کو بھی غیر معمولی اور تہہ دار بنانے کا عمل ہوتا ہے، وہ اعلیٰ تخلیقی یافت کی ضمانت ہے۔ اس میں عصری حسیت، عصری مزاج اور عصری تقاضے کا پرتو بھی واضح طور پر جھلکتا ہے۔

چنانچہ موجودہ عہد کا یہ تقاضہ ہے کہ جدید شعراء اور جدید شعری منظر نامے پر تنقیدی اظہار خیال کے ساتھ ساتھ کلاسیکی شاعری کے شعری سرمائے کی تفہیم وتعبیر کے سامان بھی فراہم کئے جائیں۔ اس کے لئے عصری تقاضوں کو سامنے رکھ کر نفسیاتی تحلیل وتجزیے کئے جائیں، تاکہ نئے جہانِ معنی ومطالب سے ایک نیا منظر نامہ سامنے آسکے۔

ان دنوں دبی دبی زبان میں اس امر کا اظہار کیا جارہا ہے کہ عہد حاضر میں ادب پر جمود طاری ہے اور عہد حاضر کے شعراء فکر وفن کی اس بلندی تک نہیں پہنچ پا رہے ہیں، جو میرؔ، غالبؔ، اقبالؔ، مومنؔ، اخترؔ شیرانی، فراقؔ وفیضؔ اور جوشؔ وغیرہ کی شعری تخلیقات سے متعین

Scanned by CamScanner

ہوتی ہیں۔اس کی وجہ یہ بتائی جارہی ہے کہ عہد حاضر میں چونکہ کوئی بڑی تحریک پیش نظر نہیں ہے،اس لئے شاعری اس مرتبہ اور معیار سے دور ہے۔

میں اس سے اتفاق نہیں کرتا،اس لئے کہ موجودہ اردو شاعری اپنی تمام تر رعنائیوں، شگفتگی،دلفریبیوں،اور فکری وفنی حسن ومعنیٰ کے ساتھ سامنے آرہی ہے وہ کئی نئی تحریکوں کو پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔موجودہ اردو شاعری کا غائر مطالعہ یہ واضح کرتا ہے کہ عہد حاضر کی شاعری تخلیقی وسعت کے ساتھ ساتھ ایک نئی راہ متعین کررہی ہے۔

موجودہ اردو شاعری میں تخلیقی فعالیت کے زیر اثر مسلک اور رویے میں کچھ تبدیلیاں ضرور رونما ہوئی ہیں۔کل تک اردو شاعری،جس جامد وساکت فلسفہ حیات کے نکات کے حصار میں مقید تھی (بعض بڑے شاعروں کی شاعری اس سے مستثنیٰ ہے) اب ایک آزاد فضا میں سانس لے رہی ہے۔اس میں نئے اسالیب،عہد ساز شعری رجحانات اور جدید افکار و اقدار کی شمولیت نے نئے جہان معنی سے متعارف کرایا ہے اور حیات و کائنات کی رمق کو محسوس کرانے کے ساتھ ساتھ تصوراتی حدود سے باہر نکال کر تشریح وتفہیم کے نئے فکر وآہنگ سے روشناس کرایا ہے۔اس ضمن میں سینکڑوں غزلیں،نظمیں اور دیگر اصناف سخن کے نمونے پیش کئے جاسکتے ہیں۔

اپنے اس مجموعۂ مقالات میں،میں نے ان ہی نکات کو سامنے رکھ کر شاعر اور شاعری کے زمان ومکاں اور تخلیق کی روح میں اُترنے کی کوشش کی ہے،جس کے بغیر کسی بھی فنکار کے فن کی افہام وتفہیم اور نقد ونظر تک رسائی ممکن نہیں ہے۔

عصر حاضر کے جن شعرا کے فن کا میں نے تنقیدی مطالعہ پیش کیا ہے صرف وہی عہد حاضر کے نمائندہ شاعر ہیں،ایسا قطعی نہیں ہے،مجھے اس امر کا شدت سے احساس ہے کہ ایسے اور بہت سارے شاعر ہیں،جو یقینی طور پر عہد حاضر کی بھرپور نمائندگی کررہے ہیں،لیکن تنگیٔ وقت اور محدود صفحات نے فی الحال ان پر قلم اٹھانے کا موقع نہیں دیا ہے۔آئندہ اس کی تلافی کی جائے گی۔

■ سیّد احمد قادری

Scanned by CamScanner

میر تقی میرؔ

نام : میر محمد تقی
تخلص : میرؔ
ولادت : ۱۷۲۳ء (اکبر آباد، موجودہ آگرہ)
وفات : ۱۸۱۰ء (لکھنؤ میں)
نام والد : میر محمد علی
تصانیف :

سات اردو دیوان
ایک فارسی دیوان
ایک اردو شاعروں کا تذکرہ 'تذکرہ شعرائے اردو'
فارسی زبان میں خودنوشت سوانح حیات ''ذکرِ میر''

rekhta
Scanned by CamScanner

میر تقی میر کی شاعرانہ عظمت

اردو شاعری کی تاریخ پر اگر روشنی ڈالی جائے تو ولی اور فائز کے بعد جن شعراء کا نام ذہن میں آتا ہے، ان میں میر، غالب، اقبال، سودا، درد، آتش اور مومن وغیرہ کے نام اہمیت کے حامل ہیں۔ جن کی شاعری سے اردو شاعری کی تاریخ مرتب کی گئی ہے۔

ان تمام شعراء میں میر، اقبال اور غالب کا اپنا ایک منفرد مقام ہے، ان کی شاعری میں وہ تمام عناصر بدرجہ اتم موجود ہیں، جو درحقیقت شاعری کو شاعری کا پیراہن بخشتے ہیں اور کچھ باتیں ایسی ہیں جو ان شعرا کو انفرادیت بخشنے کے ساتھ ساتھ قدرے مشترک سے دور لے جاتی ہیں۔

مثال کے طور پر اقبال کے فن میں مذہب اور فلسفہ کی رنگ آمیزی ہے تو غالب کے کلام میں تشکیک، تفکر، بے ساختگی، زبان کی شعلگی اور روانی ہے اور ان دونوں سے جدا میر کے یہاں لطافت وشیرینی کے ساتھ ساتھ جو نشتریت پائی جاتی ہے وہ دوسرے شعراء کے حصے میں بہت کم آئی ہے اور یہی وہ خصوصیات ہیں جن کی بنا پر میر کو تمام اردو شعراء کے مقابلے میں انفرادیت اور برتری حاصل ہے، اس کا اعتراف پرستاران میر کے علاوہ خود علاّمہ اقبال نے بھی کیا ہے۔

ع آپ بے بہرہ ہیں جو معتقد میر نہیں

میر کے کلام میں غم و الم کی کیفیات، حسرت و یاس کے تڑپتے ہوئے جذبات اور سوز و عشق کے مکاشفات زیادہ تر پائے جاتے ہیں اور ان تمام عناصر میں اتنی تڑپ اور کسک ہوتی ہے کہ دل کی گہرائیوں میں سیدھے اترتے چلے جاتے ہیں۔

میر کے کلام میں یہ اجزاء کیوں کر پائے گئے؟ درد والم شاعرانہ پیرایہ میں کیوں کر ڈھلے؟ ان سوالات کے جواب کے لئے اگر ہم مختصر طور پر میر کی زندگی کا جائزہ لیں تو وہ تمام

Scanned by CamScanner

باتیں کھل کر ہمارے سامنے آجائیں گی۔ جنھیں میرؔ نے اپنا خاص موضوع بنایا اور اپنے دردو داغ و جستجو و آرزو کو شاعری کے قالب میں ڈھالا ہے۔

ملک زوال پذیر تھا، شاہی دربار ختم ہو رہے تھے اور ہندوستان ایک نئے سیاسی بحران سے دوچار تھا۔ ان حالات میں میرؔ نے ۱۷۲۲ء میں اکبرآباد (موجودہ آگرہ) میں آنکھیں کھولیں۔ ابھی سن شعور کو پہنچے بھی نہیں تھے کہ دس گیارہ سال کی عمر میں ان کے والد چل بسے۔ سوتیلے بھائی محمد حسن کی بدسلوکی نے انہیں مزید رنج و غم سے دوچار کیا، چنانچہ بہ حالت مجبوری اس کم سنی میں تلاش معاش کے لئے دہلی پہنچے، جہاں بڑی دشواریوں کے بعد خواجہ محمود باسط کے توسط سے نواب صمام الدولہ تک ان کی رسائی ہوئی اور ایک روپیہ روزانہ وظیفہ مقرر ہو جانے کے بعد یہ اکبرآباد لوٹ گئے۔ لیکن بدقسمتی نے ان کا پیچھا نہ چھوڑا۔ اس وظیفہ کو جاری ہوئے ایک سال کا عرصہ بھی نہ گذرا تھا کہ ۱۷۲۹ء میں دلی پر نادر شاہ نے حملہ کر دیا، جس میں صمام الدولہ کا خاتمہ ہو گیا اور اس طرح ان کے ذریعہ جاری کردہ وظیفہ بھی بند ہو گیا جس سے میرؔ کافی متأثر ہوئے اور پھر انہیں اکبرآباد کو خیرباد کر کے دلی جانا پڑا، جہاں انہوں نے اپنے سوتیلے ماموں سراج الدین علی خاں آرزو کے یہاں قیام کیا، اسی دوران ایک قرابت دار لڑکی کے حسن کے اسیر ہو گئے۔ ۱۷۴۸ء میں احمد شاہ ابدالی کے حملہ کے بعد دہلی تباہ ہوتی چلی گئی۔ کچھ عرصہ تک وہاں کے امراء ان کی مدد کرتے رہے۔ لیکن جب وہ لوگ بھی مجبور ہو گئے تو میرؔ تنگ دستی اور بدحالی سے تنگ آ کر لکھنؤ پہنچے، جہاں ان کا شایان شان استقبال ہوا۔ آصف الدولہ (جو بذات خود ادب نواز تھے) نے دوسو روپیہ ماہانہ مقرر کر دیا۔ لیکن میرؔ کی نازک مزاجی، انتہا درجہ کی تھی، کسی بات پر بگڑ کر آصف الدولہ کا دربار چھوڑا تو دوبارہ وہاں نہیں گئے اور اسی بے سروسامانی اور بے روزگاری کے عالم میں اپنے دل میں دردو الم اور جستجو و آرزو کا گہرا احساس لئے ہوئے ۱۸۱۰ء میں اس عالم فانی سے رخصت ہوئے۔

لیکن جاتے جاتے اپنے تمام دردو غم والم، مصیبت و پریشانی اور حسرت و ناکامی کے جرکوں کو فارسی کا ایک، اردو کے سات دیوان، بہت سی مثنویاں، ایک رسالہ فیض میر، ایک تذکرہ نکات الشعراء اور ذکر میرؔ، خودنوشت سوانح عمری کی شکل میں چھوڑ گئے، جس نے اردو شاعری کو ایک نیا رنگ و آہنگ عطا کیا اور اردو شاعری کو اس قابل بنایا کہ لوگ انہیں ''خدائے سخن'' کہنے پر مجبور ہو گئے۔

اس طرح ان کی زندگی کا مختصر جائزہ لینے کے بعد یہ بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی

Scanned by CamScanner

شاعری خاص طور پر غزلوں میں جو بے پناہ شعریت و نشتریت پائی جاتی ہے، اس کا سبب میر کے وہ احساسات و جذبات تھے جو مختلف حالات نے پیدا کئے جن سے میر دوچار ہوئے۔

بچپن میں ان کا یتیم ہو جانا، تلاش معاش میں دردر کی خاک چھاننا اور اس میں ناکامی کا ملنا، عزیزوں اور رشتہ داروں کی بدسلوکی، دہلی کا انتشار، مغلیہ سلطنت کا زوال اور ناکامی عشق۔ ان تمام عوامل نے میر کے دل میں درد و غم اور رنج و آلام پیدا کیے۔ شاعرانہ طبیعت چونکہ بچپن سے پائی تھی۔ اس لئے اپنے دل کا حال، اپنی حسرت و یاس، تڑپتے ہوئے جذبات، دکھ درد کی کیفیات اور عشق کے سوز و گداز کو بلا کی سادگی، گھلاوٹ اور بے ساختگی سے اشعار میں پیش کیا۔ خاص طور پر چھوٹی بحروں والی غزلیں تو تیر و نشتر کا کام کرتی ہیں اور ان ہی خصوصیات کی بنا پر ان کی شاعرانہ عظمت کا اعتراف کرتے ہوئے بلند پایہ شعراء نے انہیں استاد سخن کہا اور ان کی تقلید کو باعث افتخار سمجھا۔ ان کی شاعری نے بڑے بڑے ناقدوں کو بھی متوجہ کیا۔ محمد حسین آزاد اپنی تصنیف ''آب حیات'' میں میر کی شاعری سے متعلق رقم طراز ہیں:

> ''میر صاحب کی زبان شستہ، کلام صاف، بیان ایسا پاکیزہ جیسے باتیں کرتے ہیں۔ دل کے خیالات کو جو سب طبیعتوں کے مطابق ہیں، محاورہ کا رنگ دے کر باتوں باتوں میں ادا کر دیتے ہیں۔ اور زبان میں خدا نے ایسی تاثیر دی ہے کہ وہی باتیں ایک مضمون بن جاتی ہیں۔ اسی واسطے ان میں بہ نسبت اور شعراء کے اصلیت کچھ زیادہ قائم رہتی ہے بلکہ اکثر جگہ یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ نیچر کی تصویر کھینچ رہے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ دلوں پر اثر بھی زیادہ کرتی ہے۔ گویا اردو کے سعدی ہیں۔''

یہ میر کی شاعرانہ عظمت ہی ہے کہ ان کی شاعری کا موازنہ کوئی سعدی سے کرتا ہے تو کوئی انگریزی کے مشہور شاعر سر فلپ لسڈنی سے تو کوئی دوسرے مشہور مغربی شعراء سے۔

مجنوں گورکھپوری میر کی شاعری کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''ان کی (میر کی) شاعری محض رسم و روایت پر مبنی نہیں ہے۔ وہ انگریزی کے مشہور شاعر سر فلپ لسڈنی کی طرح جو کچھ لکھتے تھے، اپنے دل کی کیفیتوں کا جائزہ لے کر لکھتے تھے۔ ان کا قال سراسر حال ہے۔''

Scanned by CamScanner

میرؔ کا ہر شعر جز میں کل وسید ھے سادے دل میں اتر جانے والے اور سادگی، روانی اور پُر کاری لئے ہوتے ہیں اور یہی وہ اوصاف ہیں جو میرؔ کو انفرادیت بخشتے ہیں۔ مثال کے لئے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

کہا میں نے کتنا ہے گل کا ثبات
کلی نے یہ سن کر تبسم کیا

☆

نازکی اس کے لب کی کیا کہئے
پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے

☆

مجھے کام رونے سے اکثر ہے ناصح
تو کب تک میرے منہ کو دھوتا رہے گا

☆

ہم تو ناکام ہی جہاں میں رہے
یاں کبھو اپنا مدعا نہ ہوا

☆

مت ڈھلک مژگاں سے اب تو اے اشکِ آبدار
مفت میں جاتی رہے گی تیری موتی کی سی آب

☆

پھرتے ہو میرؔ صاحب سے جُدا جُدا تم
شاید کہیں تمہارا دل ان دنوں لگا ہے

☆

الٹی ہوگئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا
دیکھا اس بیماریٔ دل نے آخر کام تمام کیا

Scanned by CamScanner

عہد جوانی رو رو کاٹا پیری میں لیں آنکھیں موند
یعنی رات بہت تھے جاگے صبح ہوئی آرام کیا

☆

پتا پتا بوٹا بوٹا حال ہمارا جانے ہے
جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے باغ تو سارا جانے ہے

☆

ایسے خوبصورت اور سادہ اشعار کہہ کر میرؔ نے پرانی روایات کو توڑا اور ایک نئی راہ اپنائی اور اپنے ہم عصر شعراء مثلاً مرزا محمد رفیعؔ، سوداؔ، خواجہ میر دردؔ، مرزا جان جاناں مظہرؔ، مصحفیؔ، انشاء اللہ خاں انشاؔ، قائمؔ، سوزؔ اور حاتمؔ جیسے اساتذہ شعراء کو بہت پیچھے چھوڑ دیا اور اپنے رنگ و آہنگ اور بے پناہ شعر گوئی سے اپنا ایک خاص اور منفرد مقام بنایا۔ یوں تو میرؔ نے مرثیہ، مثنوی، رباعی، قصیدہ، مسدس، اتزاد، ترجیع بند، ترکیب بند، دوہے، اور واسوخت جیسی مختلف اصناف شاعری پر طبع آزمائی کی، لیکن میرؔ کو جو اعلیٰ مقام حاصل ہوا وہ ان کی غزلوں میں بے پناہ حسن اور فنی محرکات کی بنا پر۔ بقول آزاد :

"اردو شاعری میں اس سے (میرؔ سے) زبردست غزل گو نہ کوئی پیدا ہوا ہے نہ ہوگا۔"

میرؔ کی بے مثال غزل گوئی کا اعتراف غزل کو نیم وحشی صنف سخن کہنے والے ناقد کلیم الدین احمد نے بھی کیا ہے وہ "اردو شاعری پر ایک نظر" میں فرماتے ہیں:

"سوز دروں سے میرؔ کی چھاتی جلا کرے ہے، اسی وجہ سے میرؔ کی شاعری نہیں ایک شعلہ رقصاں ہے۔"

آج کل بے قرار ہیں ہم بھی
بیٹھ جا چلتے یار ہیں ہم بھی
آن میں کچھ ہیں آن میں کچھ ہیں
تحفۂ روزگار ہیں ہم بھی
نالے کو یوں سمجھ کر اے بلبل
باغ میں یک کنار ہیں ہم بھی

Scanned by CamScanner

ان اشعار میں کیسی حسرت کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔ان حسرتوں کا سادگی، صفائی، پاکیزگی اور ترنم کے ساتھ بیان ہے۔ جب میؔر اپنے جذبات کی ترجمانی کرتے ہیں، ایسے جذبات کی جو ذاتی طور پر انہوں نے محسوس کیا ہے۔ایسے اشعار میں ایک حیرت انگیز سادگی پائی جاتی ہے۔سیدھے سادے، مختصر نرم و ملائم لفظوں میں وہ اپنے اچھوتے احساسات و تاثرات کو صفائی، درد انگیزی اور جامعیت کے ساتھ بیان کرتے ہیں اور ان کے شعروں میں ایسا ترنم پنہاں ہوتا ہے کہ گویا ان میں روحِ موسیقی آ بسی ہے۔ وہ ان معمولی لفظوں میں ایسا جادو بھر دیتے ہیں کہ جس سے دل پر گہرا اثر ہوتا ہے اور ان کی فطرت بدل جاتی ہے۔ ہر لفظ اپنی جگہ پر جامعیت و معنویت کا اظہار کرتے ہیں۔لفظوں کی ترتیب بھی عموماً وہی ہوتی ہے جو بول چال میں مستعمل ہے۔ یہ تو معلوم ہی نہیں ہوتا کہ غزل لکھی گئی ہے۔ بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا کوئی باتیں کر رہا ہے اور باتیں بھی ایسی جو دل میں سیدھے اترتی چلی جاتی ہیں۔اگر ہر لفظ کو الگ الگ لکھا جائے تو الفاظ میں کوئی خاص بات نہیں لیکن ان کے میل سے ایک عجیب سی سحر پیدا ہو جاتی ہے۔

جذبات و احساسات سے بھرپور میؔر کی شاعری نے ایسا جادو کیا کہ کٹر سے کٹر نقاد کو بھی ان کی جانب متوجہ ہونا پڑا۔بعض نقادوں نے ان کی شاعری کو عالمگیر مقبولیت کا حامل بتایا ہے۔فراؔق گورکھپوری ''میر کی عالمگیر مقبولیت'' کے تحت لکھتے ہیں:

> ''میؔر کے بکھرے ہوئے آنسوؤں میں ہمیں بحرِ حیات کی وسعتوں اور گہرائیوں کا اندازہ ہوتا ہے۔میؔر کی آہ و فغاں میں شش جہت کی ہواؤں کی سنسناہٹ ہے۔''

میر جب اپنے دل پر ہاتھ رکھتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس نے انسانیت کے دل پر ہاتھ رکھا ہے۔

لیکن ان تمام خوبیوں کے ساتھ ساتھ میؔر کے کلام کو پڑھنے کے بعد یہ احساس بھی شدت سے ہوتا ہے کہ میر کا مطالعہ و مشاہدہ بہت ہی محدود دائرہ تک مخصوص تھا۔اکثر و بیشتر ان کے کلام میں درد و غم کے نمونے ہی پائے جاتے ہیں اور جب کبھی میر نے اپنے اس حدود و مخصوص دائرے سے باہر نکلنے کی کوشش کی ہے، انہیں بری طرح ناکامی کا سامنا کرنا پڑا ہے۔

Scanned by CamScanner

مثلاً ایک جانب میرؔ :

اپنی ہستی حباب کی سی ہے
یہ نمائش سراب کی سی ہے
نازکی اس لب کی کیا کہئے
پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے

جیسی بے پناہ اور اپنے مخصوص رنگ کی شاعری کی ہے تو دوسری جانب انہوں نے :

نقطۂ خال سے ترا آبرو
بہت اک انتخاب کی سی ہے
آتشِ غم میں دل بھنا شاید
دیر سے بُو کباب کی سی ہے

جیسی بے سرو پا اور خامیوں سے پُر شاعری بھی ہے، جسے ایک عام قاری بھی محسوس کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ لیکن ان تمام تعریفوں کے باوجود میرؔ کی شاعری کے متعلق کسی کی یہ رائے کہ:

''بلندش بغایت بلند و پستش بغایت پست۔''

میرے خیال میں صحیح ہے کیونکہ ــــــ

لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام
آفاق کی اس کارگہہ شیشہ گری کا

جیسے اشعار کہنے والے شاعر کے یہاں ایسے اشعار بھی اکثر مل جاتے ہیں :

آتشِ غم میں دل بھنا شاید
دیر سے بو کباب کی سی ہے

ایسے بہت سارے اشعار ہیں جو فکر، تخیل اور فنی نقطۂ نگاہ سے بے حد پست اور غیر معیاری ہیں، لیکن دوسری جانب میرؔ نے اپنی غزلوں میں جو غم والم کو معنویت، وسعت اور وقار بخشا ہے، اس سے نہ صرف میرؔ کی عظمت میں اضافہ ہوتا ہے، بلکہ اردو غزل گوئی کو بھی ایک سمت و رفتار ملی، اس کا بھی اعتراف ضروری ہے۔

☆☆

Scanned by CamScanner

مرزا غالبؔ

نام : نجم الدولہ دبیر الملک مرزا اسد اللہ خاں غالب، المعروف، مرزا نوشہ

تخلص : پہلے اسد بعد میں غالب

ولادت : ۲۷؍دسمبر ۱۷۹۷ء (آگرہ)

وفات : ۱۵؍فروری ۱۸۶۹ء (دہلی)

نام والد : عبداللہ بیگ خان بہادر

تصانیف:

۱۔ دیوان فارسی: (تقریباً دس ہزار اشعار)

۲۔ دیوان ریختہ: (مختصر دیوان اردو میں)

۳۔ مہر نیمروز: (تاریخ خاندان تیموریہ، نثر میں)

۴۔ دستنبو : (ایام غدر ۱۸۵۷ء میں اپنی تباہی و بربادی کا حال نثر میں)

۵۔ پنج آہنگ: (اپنے خطوط، دیباچے، خاتمے کتب کے، اصطلاحی محاورے، قواعد فارسی، الفاظ اور مصادر درج ہیں)

۶۔ عود ہندی: (خطوط غالب، اکتوبر ۱۸۶۸ء، طبع اوّل)

۷۔ اردوئے معلّٰی: (خطوط غالب ۶؍مارچ ۱۸۶۹ء طبع اوّل)

۸۔ قاطع برہان: (مشہور کتاب برہان قاطع کی خامیاں اجاگر کی گئی ہیں)

۹۔ کلیات فارسی (۱۸۶۳ء میں طبع اوّل)

۱۰۔ دیوان غالب

rekhta

Scanned by CamScanner

مرزا غالبؔ: تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ.........

مرزا غالبؔ کی شراب نوشی کے قصّے، ڈومنی سے عشق کی داستان اور جوا کے سلسلے میں جیل جانے کے واقعہ سے پوری اردو دنیا واقف ہے۔ روزہ نماز سے بھی یہ ہمیشہ دور ہی دور رہے، اس لئے ان کے حج وزکوٰۃ کا ذکر ہی بے جا ہے۔ خود غالبؔ کو اپنی ان تمام برائیوں اور خامیوں کا شدت سے احساس تھا اور اسی بنا پر یہ خود کو آدھا مسلمان کہا کرتے تھے۔ ان کے چند اشعار اس سلسلے میں ملاحظہ ہوں ۔

زندگی اپنی جو اس شکل سے گزری غالبؔ
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے!

☆

ہوگا کوئی ایسا بھی کہ غالبؔ کو نہ جانے
شاعر تو وہ اچھا ہے پہ بدنام بہت ہے

☆

آتا ہے داغِ حسرتِ دل کا شمار یاد!
مجھ سے مرے گناہ کا حساب اے خدا نہ مانگ

ان تمام احساسات کے باوجود غالبؔ خود کو عشق و محبت اور رندی اور سرمستی سے الگ نہ کر سکے۔ بلکہ مختلف انداز سے اپنے تجربات اور تفکرات کو اپنی شاعری میں بیان کرتے رہے۔ عشق کے متعلق غالبؔ فرماتے ہیں ۔

Scanned by CamScanner

عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالبؔ کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے!

اور پھر اس بات کا بھی اعتراف کرتے ہیں کہ

دھول دھپّا اس سراپا ناز کا شیوہ نہیں
ہم ہی کر بیٹھے تھے غالبؔ پیش دستی ایک دن

☆

عشق نے غالبؔ نکمّا کر دیا
ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

ظالم شراب جو عمر بھر غالبؔ کے منہ سے نہ چھوٹی، اس کی تعریف انہوں نے خوب خوب کی ہے۔ یہ شراب انہیں کتنی عزیز تھی اسے ملاحظہ فرمائیں

قرض کی پیتے تھے مے، لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں
رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن

گو ہاتھ میں جنبش نہیں آنکھوں میں تو دَم ہے
رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے

لیکن اس کے ساتھ ساتھ انہیں یہ بھی احساس تھا کہ

تو نے قسم مے کشی کی کھائی ہے غالبؔ
تیری قسم کا کچھ اعتبار نہیں

ایسی صورت میں اگر غالبؔ کے دین و ایمان کا ذکر کیا جائے تو یہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ مرزا غالبؔ جن کی شخصیت اور شاعری ہماری ادبی تاریخ کا ایک اہم باب ہے اور ادبی شعور پر ہنوز حاوی ہے، وہ اسلام پر پختہ یقین رکھتے تھے۔ اور توحید وجودی کو اسلام کا اصل اصول اور رکن جانتے تھے۔ اس امر کا ٹھوس ثبوت اس ایک واقعہ سے لگایا جا سکتا ہے کہ حالیؔ مرحوم نے ایک روز مرزا غالبؔ کی بزرگی، استاذی، کبرسنی اور شعری عظمت کو بالائے طاق رکھ کر نماز پنجگانہ اور فرضیت کی تاکید پر ایک لمبا چوڑا لکچر لکھ کر ان کے سامنے پیش کیا تو ان کا جواب تھا :

Scanned by CamScanner

''اس میں شک نہیں کہ میں موحد ہو لیکن ہمیشہ تنہائی اور سکون کے عالم میں یہ کلمات میری زبان پر جاری رہتے ہیں۔ لا الـہ الا اللــہ لا موجوداً الّا الله لا موثر فی الوجود الا الله.........''

مرزا غالب کا یہ دعویٰ غلط نہیں معلوم ہوتا ہے۔ جب یہ باتیں نظر سے گزرتی ہیں کہ مرزا نے جو کچھ پایا اسے خدائے برتر کا کرم سمجھا۔ انہیں اس بات کا بھی مکمل یقین تھا کہ تمام باتوں کا علم صرف خدا ہی کی ذات کو ہے۔ غالبؔ نے ''قاطع برہان'' کے اخیر میں چند فوائد لکھے ہیں۔ ان میں فائدہ اوّل کا ماحصل یہ ہے :

''میں خدا کا شکر ادا کرتا ہوں اور خدا کے سوا کوئی نہیں جان سکتا کہ ان باون برسوں میں اس نے کس قدر معنیٰ کے دروازے مجھ پر کھولے ہیں اور میری فکر کو کس درجے کی بلندی بخشی ہے۔''

خدا پر ایمان کے بعد رسول اللہ اور خانہ کعبہ کی کس حد تک عزّت و احترام غالبؔ کے دل میں تھا اس کا اندازہ ان کے قید ہونے کے ناخوشگوار واقعہ کے بعد ان کے ایک خط سے لگایا جا سکتا ہے۔ لکھتے ہیں :

'' آرزو کرنا آئین عبودیت کے خلاف نہیں ہے، میری آرزو ہے کہ اب دنیا میں نہ رہوں اور اگر رہوں تو خانۂ کعبہ کی جائے پناہ اور آستانۂ رحمۃ للعالمین دیواروں کی تکیہ گاہ ہو۔''

مرزا غالبؔ مسلمانوں کی کسی ذلّت و رسوائی کی بات سن لیتے تو انہیں نہایت دکھ اور رنج ہوتا تھا۔ اس سلسلے میں ''یادگار غالبؔ'' میں حالیؔ مرحوم فرماتے ہیں:

''مرزا.................مسلمانوں کی ذلّت کی کوئی بات سن پاتے تھے تو ان کو سخت رنج ہوتا تھا۔ ایک روز میرے سامنے اسی قسم کے ایک واقعہ پر نہایت افسوس کرتے تھے اور کہتے تھے........مجھ میں کوئی بات مسلمانی کی نہیں۔ پھر بھی میں نہیں جانتا کہ مسلمانوں کی ذلّت پر مجھ کو کیوں اس قدر رنج و تاسف ہوتا ہے۔''

یہ باتیں ثابت کرتی ہیں کہ غالبؔ، اللہ اور اس کے رسولؐ پر مکمل ایمان رکھتے تھے۔ ساتھ ہی

انہیں قرآن پر اعتقاد اور اس کے نظریات اور واقعات پر بھی یقین کامل تھا۔ اور یہی وجہ ہے کہ جہاں ان کی شاعری میں حسن پرستی، جام و مینا، حیات و موت، صبر و اختیار اور سوز و ساز کے فلسفیانہ نظریات ملتے ہیں وہیں قرآنی نظریات، معتقدات، واقعات اور عقاید سے متعلق تلمیحات بھی جا بجا ملتی ہیں۔ مثال کے طور پر گناہ و ثواب، جنت و دوزخ، حور و فرشتہ، حشر و نشر، حساب و کتاب کے تصورات اور حضرت یوسف علیہ السلام کا حسن اور زلیخا کا عشق، حضرت خضر علیہ السلام اور موسیٰ علیہ السلام کی ملاقات، حضرت ابراہیم علیہ السلام اور نمرود، حضرت موسیٰ علیہ السلام اور کوہ طور وغیرہ کے قرآنی واقعات سے بھی مرزا غالبؔ نے اپنے کلام میں رنگ بھرا ہے۔

گرتی تھی ہم پہ برق تجلی نہ طور پر!
دیتے ہیں بادہ ظرف قدح خوار دیکھ کر

☆

کیا فرض ہے کہ سب کو ملے ایک سا جواب
آؤ نہ ہم بھی سیر کریں کوہ طور کی!

☆

ان دونوں شعر میں غالبؔ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے کوہِ طور پر خدا کی تجلی دیکھ کر غش کھانے کا ذکر کیا ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام کے جنت سے نکلنے کے دلچسپ واقعہ کو غالبؔ نے اپنے شاعرانہ اور شوخ انداز میں یوں پیش کیا ہے۔

نکلنا خلد سے آدم کا سنتے آئے ہیں لیکن
بڑے بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے

حضرت ابراہیم علیہ السلام پر نمرود کے ظلم و ستم کا قصہ قرآن مجید میں تفصیل سے موجود ہے۔ غالبؔ نے اپنے ایک شعر میں اسے اس طرح بیان کیا ہے۔

کیا وہ نمرود کی خدائی تھی
بندگی میں میرا بھلا نہ ہوا

یوسف علیہ السلام اور یعقوب علیہ السلام کی جدائی اور پھر زلیخا کے عشق کی داستان کا بیان

Scanned by CamScanner

فارسی اور اردو کے شعراء نے اپنے اپنے انداز سے قلم بند کیا ہے لیکن غالبؔ کے کلام میں کتنی ندرت اور انفرادیت ہے، یہ دیکھئے، کہتے ہیں۔

قید میں یعقوب نے لی گو نہ یوسف کی خبر
لیکن آنکھیں روزن دیوار و زنداں ہو گئیں

سب رقیبوں سے ہوں ناخوش پر زنانِ مصر سے
ہے زلیخا خوش کہ محو ماہ کنعاں ہو گئیں

☆

نہ چھوڑی حضرت یوسف نے یاں بھی خانہ آرائی
سفیدی دیدۂ یعقوب کی پھرتی ہے زنداں پر

☆

یوسف اس کو کہوں اور کچھ نہ کہے خیر ہوئی
گر بگڑ بیٹھے تو میں لائقِ تعذیر بھی تھا

☆

ہنوز ایک پرتو نقشِ خیال یار باقی ہے
دل افسردہ گویا حجرہ ہے یوسف کے زنداں کا

☆

اللہ تعالیٰ کے یہاں روزِ حشر سزا اور جزا کا حساب کتاب ہوگا۔ یہ ایک قرآنی عقیدہ ہے، جسے غالبؔ نے یوں پیش کیا ہے۔

ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد
یارب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے

قیامت کا تصور بھی قرآن میں موجود ہے اور اس تصور کا اظہار غالب نے اس طرح کیا ہے۔

جاتے ہوئے کہتے ہو قیامت کو ملیں گے
کیا خوب قیامت کا ہے گویا کوئی دن اور

Scanned by CamScanner

خدا کے نیک بندوں کو جنّت میں حوریں ملیں گی اس کا ذکر قرآن حکیم میں ہے۔ غالبؔ نے اس سلسلے میں عرض کیا ہے۔

ایک خوں چکاں کفن میں کروڑوں بناؤں میں
پڑتی ہے آنکھ تیرے شہیدوں پہ حور کی

☆

تسکین کو ہم نہ روئیں جو ذوق نظر ملے
حوران خلد میں تیری صورت اگر ملے

☆

ان پری زادوں سے لیں گے خلد میں ہم انتقام
قدرت حق سے یہی حوریں اگر واں ہو گئیں

☆

حسن میں حور سے بڑھ کر نہیں ہونے کے کبھی
آپ کا شیوہ و انداز و ادا اور سہی

☆

سامنا حورو پری نے نہ کیا نہ کریں
عکس تیرا ہی مگر تیرے مقابل آئے

☆

غالبؔ جنت کی شراب طہور کے متعلق فرماتے ہیں۔

واعظ نہ پیئے نہ کسی کو پلا سکو!
کیا بات ہے تمہاری شراب طہور کی

☆

انسان کی نیکی اور بدی کے سلسلے میں قرآن مجید میں کراماً کاتبین کا ذکر آیا ہے۔ اس قرآنی نظریہ کو مختلف شعرا نے مختلف انداز سے اپنے کلام میں پیش کیا ہے لیکن غالب اس ذکر کو

Scanned by CamScanner

شکایت کے طور پر یوں کرتے ہیں۔

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق
آدمی کوئی ہمارا دمِ تحریر بھی تھا

کافر اور گنہ گار میں بیّن فرق ہے اور اس کا ذکر قرآن میں کئی جگہ آیا ہے اس سلسلہ میں غالبؔ فرماتے ہیں ۔

حد چاہیئے سزا میں عقوبت کے واسطے
آخر گنہ گار ہوں کافر نہیں ہوں!

روز قیامت کے سلسلے میں قرآن مجید میں ذکر ہے کہ اس دن صور پھونکے جائیں گے حشر برپا ہوگا، اور لوگوں کے اعمال کا حساب و کتاب ہوگا۔ چنانچہ اس قرآنی عقیدہ کو غالبؔ نے اس شعر میں کچھ اس طرح پیش کیا ہے ۔

لڑتا ہے مجھ سے حشر میں قاتل کہ کیوں اٹھا
گویا ابھی سنی نہیں آواز صور کی

والئے اگر مرا ترا انصاف حشر میں نہ ہو
اب تلک تو یہ توقع ہے کہ واں ہو جائے گا

جب تک کہ نہ دیکھا تھا قد یار کا عالم
میں معتقد فتنۂ محشر نہ ہوا تھا
نہیں کہ مجھ کو قیامت کا اعتقاد نہیں
شب فراق سے روز جزا یاد نہیں

قرآنی عقاید میں ایک عقیدہ یہ بھی ہے کہ ہر شخص کی موت کا ایک دن مقرر ہے، اس کا احساس غالبؔ کو بھی ہے فرماتے ہیں ۔

موت کا ایک دن معیّن ہے
نیند کیوں رات بھر نہیں آتی

Scanned by CamScanner

غالب کو اپنا ایمان کتنا عزیز تھا اس کا اظہار انھوں نے اپنے ایک شعر میں یوں کیا ہے ۔

کیوں کر اس بت سے رکھوں جان عزیز
کیا نہیں ہے مجھے ایمان عزیز

اور چونکہ حضرت غالب کو اپنے گناہوں کا شدت سے احساس ہے اور اپنے اعمال پر پریشانی بھی، اس لئے مرزا غالب کعبہ کا ذکر ان لفظوں میں کرتے ہیں ۔

کعبہ کس منہ سے جاؤ گے غالب
شرم تم کو مگر نہیں آتی

گویا ہم کہہ سکتے ہیں کہ کیا عجب مرزا غالب واقعی ولی ہوتے جو نہ بادہ خوار ہوتے ۔
غالب خود فرماتے ہیں ۔

یہ مسائل تصوف، یہ ترا بیان غالب
تجھے ہم ولی سمجھتے، جو نہ بادہ خوار ہوتا

Scanned by CamScanner

علّامہ اقبال

نام : ڈاکٹر محمد اقبال
تخلص : اقبالؔ
ولادت : ۹؍نومبر ۱۸۷۷ء، بروز جمعہ، بمقام: سیالکوٹ
وفات : ۲۱؍اپریل ۱۹۳۸ء، بروز جمعرات، بمقام: لاہور
نام والد : شیخ نور محمد
تعلیم : ایم۔اے (فلسفہ) گورنمنٹ کالج، لاہور، ۱۸۹۹ء
پی۔ایچ۔ڈی: میونخ یونیورسیٹی، جرمنی ۱۹۰۷ء

تصنیفات :

(۱) علم الاقتصیاد۔ اقتصادیات کے موضوع پر پہلی تصنیف ۱۹۰۳ء میں لاہور سے شائع ہوئی۔
(۲) تاریخ ہند۔ (مڈل درجوں کے لئے) ۱۹۱۳ء میں شائع ہوئی۔
(۳) اسرار خودی (فارسی) ۱۹۱۵ء
(۴) رموز بے خودی (مثنوی۔ ۱۹۱۸ء طبع اوّل)
(۵) پیام مشرق (فارسی) (۱۹۲۳ء طبع اوّل)
(۶) بانگ درا (اردو نظموں، غزلوں کا مجموعہ ۱۹۲۴ء)
(۷) زبور عجم (فارسی نظموں، غزلوں، قطعات، مثنوی کا مجموعہ، ۱۹۲۷ء)

Scanned by CamScanner

(۸) Reconstruction Religious Thought in Islam (تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ۔ انگریزی میں یہ کتاب ۱۹۳۱ء میں شائع ہوئی، جو کہ چھ فلسفیانہ خطبات کا مجموعہ ہے)

(۹) جاوید نامہ ۔ اٹلی کے مشہور شاعر دانتے کی طویل نظم ''ڈیوائن کامیڈی'' کا جواب ہے، جو ۱۹۳۲ء میں شائع ہوئی۔

(۱۰) بال جبریل۔ اردو میں رباعیات، قطعات، غزلیات اور منظومات کا مجموعہ ۱۹۳۵ء میں شائع ہوا۔

(۱۱) ضرب کلیم۔ اپریل ۱۹۳۶ء میں شائع ہوئی۔

(۱۲) پس چہ باید کرد اے اقوام مشرق (فارسی مثنوی، ستمبر ۱۹۳۶ء میں شائع ہوئی۔)

(۱۳) ارمغان حجاز۔ فارسی کلام کے ساتھ اردو کی نظمیں، قطعات، بعد از مرگ ۱۹۳۸ء میں شائع ہوئی۔

Scanned by CamScanner

علّامہ اقبالؔ کی عالمی مقبولیت

اگر علاّمہ اقبالؔ کے متعلق کوئی یہ کہتا ہے کہ ''وہ فلسفہ کے امام ہیں، اقتصادیات پر ان کی گہری نگاہ ہے، علم الاقوام بھی ان کے ذہن ودماغ میں رچا بسا ہوا ہے وہ دنیا کے نئے رجحانات وتصورات سے بھی واقف ہیں۔ وہ قیصریت کے بھی اداشناس ہیں، اور فسطائیت کے رموز بھی جانتے ہیں، وہ جمہوریت کے اسرار کے بھی ماہر ہیں اور اشتراکیت کی گہرائیوں میں غوطے لگا چکے ہیں۔ غرض کہ دنیا کی کوئی تحریک، کوئی رجحان، کوئی تصور ایسا نہیں ہے جس سے اقبالؔ واقف نہ ہوں جس کا اقبالؔ نے مطالعہ نہ کیا ہو، جس کے محرکات پر اقبالؔ کی نظر نہ ہو۔ وہ بیرونی اور مقامی نظریات جدید اور قدیم کو بھی جانتے ہیں اور انہیں پرکھ چکے ہیں'' تو غلط نہیں کہتا۔ اور یہی وجہ ہے کہ اپنی ان جملہ خصوصیات کے ساتھ ساتھ رفتہ رفتہ اقبالؔ کی شاعری اس قدر مقبول ہوئی کہ دور حاضر میں مشکل سے کسی شاعر کو یہ فخر حاصل ہے۔ ان کا کلام نہ صرف ہندوپاک بلکہ ایران، افغانستان، امریکہ، انگلستان، جرمن، فرانس، روس، عرب وغیرہ جیسے ممالک میں بھی قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔

اقبالؔ کی شخصیت اور ان کی شاعری کی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ غیر منقسم ہندوستان کی بڑی بڑی ہستیوں مثلاً جسٹس امیر علی، شمس العلماء مولوی سید علی بلگرامی، سر شیخ عبدالقادر، مولانا غلام رسول مہر، نواب بھوپال حمید اللہ خاں، سیٹھ محمد جمال، سر محمد اسمٰعیل، مہاراجہ کشن پرشاد، سر اکبر حیدری، نظام حیدرآباد، ڈاکٹر عبداللہ چغتائی، سر سید احمد خاں کے پوتے سر راس مسعود، سر سکندر حیات، لالہ لاجپت رائے، ڈاکٹر لمعہ حیدرآبادی،

Scanned by CamScanner

ہزایکسی لنسی گورنر پنجاب، سرندر سنگھ مجیٹھا، منوہر لال چودھری، سرچھوٹو رام، میاں عبدالحی، جسٹس عبدالرشید، جسٹس دین محمد، جسٹس بخشی، ٹیک چند، جے ڈی پینی، رابندر ناتھ ٹیگور، سبھاش چندر بوس، مولانا ابوالکلام آزاد، محمد علی جناح، مہاتما گاندھی اور پنڈت جواہر لال نہرو وغیرہ نے اقبال کی عظمت کا صدق دل سے اعتراف کیا ہے۔اس بات پر ان تمام حضرات کو فخر تھا کہ اقبال بھی ان کی طرح ہندوستانی ہیں۔اقبال کی قدر ومنزلت کا اندازہ ان کے انتقال کے بعد چند تعزیتی پیغامات سے بھی ہوتا ہے۔ملاحظہ فرمائیں۔

رابندر ناتھ ٹیگور لکھتے ہیں:

''ہمارے ادب میں ایک ایسا خلاء پیدا ہوگیا ہے جس کے پُر ہونے میں ایک جان لیوا زخم مندمل ہونے کی مانند بہت عرصہ لگے گا۔ ہندوستان جس کی آج دنیا میں کوئی وقعت نہیں ہے ایسے شاعر کی وفات سے اور بھی قلاّش ہوگیا ہے جس کی شاعری عالمگیر اور آفاقی شہرت کی حامل تھی۔''

مولانا ابوالکلام آزاد کہتے ہیں:

''یہ سوچ کے نا قابل بیان صدمہ دل پہ گزرتا ہے کہ اب اقبال ہم میں موجود نہیں رہے۔جدید ہندوستان اردو کا ان سے بڑا شاعر پیدا نہیں کر سکے گا۔ان کی فارسی شاعری بھی جدید فارسی ادب میں اپنا ایک خاص مقام رکھتی ہے۔ان کی وفات سے تنہا ہندوستان کو نہیں بلکہ پورے مشرق کو نقصان پہونچا ہے، ذاتی طور پر مجھے اس بات کا انتہائی قلق ہے کہ میرا ایک دیرینہ دوست مجھ سے بچھڑ گیا۔''

نیتا جی سبھاش چندر بوس نے کہا تھا:

''سر محمد اقبال کی رحلت کے یہ معنی ہیں کہ ہندوستانی ادب کے آسمان پر جو ستارے روشن تھے ان میں سے درخشاں ستارہ ٹوٹ گیا۔صف اوّل کے شاعر اور نقاد ہونے کے علاوہ سر محمد اقبال ایک منفرد کردار کے بھی حامل تھے۔ان کی رحلت سے ہم سب کو جو عظیم نقصان پہونچا ہے

Scanned by CamScanner

اسے شدت کے ساتھ سارے ملک میں محسوس کیا جائے گا۔"

محمد علی جناح نے اقبال کی عظمت کا اعتراف ان لفظوں میں کیا تھا:

''اگر میں ہندوستان میں اسلامی حکومت کو قائم ہوتا دیکھنے کے لئے زندہ رہوں اور اس وقت مجھ سے کہا جائے کہ ایک طرف اس اسلامی حکومت کے رئیس اعلیٰ کا عہدہ ہے اور دوسری طرف اقبال کی تصنیفات تو میں تصنیفات کو ترجیح دوں گا۔''

مہاتما گاندھی لکھتے ہیں:

''ڈاکٹر اقبال کے بارے میں کیا لکھوں۔ میں اتنا ضرور کہہ سکتا ہوں کہ جب ان کی مشہور نظم ''ہندوستان ہمارا'' پڑھی تو میرا دل بھر آیا۔ بڑودہ جیل میں تو سینکڑوں بار اس نظم کو گایا ہوگا۔ اس نظم کے الفاظ مجھے بہت ہی میٹھے لگے اور یہ خط لکھتا ہوں تب بھی وہ نظم میرے کانوں میں گونج رہی ہے۔''

یہ غیر منقسم ہندوستان کی چند اہم شخصیات کے تعزیتی پیغامات کے اقتباسات ہیں۔ ممکن ہے کچھ لوگ یہ کہہ کر درگزر کر دیں کہ ہندوستانیوں کو ہندوستانی شاعر سے انسیت و محبت تو ہوگی ہی۔ لیکن میں اس سے قبل بھی عرض کر چکا ہوں کہ اقبال کی شاعرانہ عظمت کا اعتراف دنیا کے بہت سارے ممالک نے کیا ہے۔ ان میں ازہر یونیورسیٹی قاہرہ کے شیخ الجامعہ، مصر کے ڈاکٹر محمد حسنین ہیکل، محمد علی پاشا، شہزادہ ولی عہد مانگرول، روم کے ڈاکٹر اسکارپا پروفیسر جنٹلی، ڈاکٹر نکلسن، مسولینی، اٹلی کے پرنس کیتانی بیرن، فلسطین کے مفتی اعظم امین الحسینی، پیرس کے میگ نون برگساں، اسپین کے پروفیسر آسین، افغانستان کے نادر شاہ سردار صلاح الدین سلجوقی وغیرہ کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان حضرات اور ان کے علاوہ دیگر عالموں، مدبروں، فلسفیوں، مفکروں، شاعروں، ادیبوں اور ناقدین نے وقتاً فوقتاً اقبال کی پر بہار شخصیت اور ان کی پُر اثر شاعری سے متاثر ہو کر اس کا اعتراف صدق دل سے کیا ہے۔ اس سلسلے میں چند شخصیتوں کے خیالات اس طرح ہیں۔ اقبال کے فلسفہ کے استاد پروفیسر تھامس آرنلڈ فرماتے ہیں:

Scanned by CamScanner

''ایسا شاگرد استاد کو محقق اور محقق کو محقق تر بنا سکتا ہے۔''

روم کے ڈاکٹر اسکارپا کہتے ہیں:

''ایسے اچھوتے نادر اور پُراز حقائق خیالات کا آدمی میں نے کبھی نہیں دیکھا۔''

اقبالؔ جب قاہرہ پہونچے تو ان کے قیام کے دوران مصر کے مشہور بزرگ سید محمد قاضی ابوالعزائم اپنے دونوں بیٹوں کے ساتھ ان سے ملنے آئے، اس موقع پر علاّمہ اقبالؔ نے ان سے مخاطب ہو کر فرمایا'' آپ نے کیوں تکلیف کی میں خود آپ کی زیارت کے لئے آپ کے پاس چلا آتا'' اقبالؔ کی اس بات پر قاضی صاحب فرمانے لگے:

''خواجہ دو جہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کا ارشاد ہے کہ جس نے دین سے تمسک حاصل کیا ہو تو اس کی زیارت کے لیے جاؤ گے تو مجھے خوشی ہوگی۔''

مسولینی نے خاص طور پر ڈاکٹر اسکارپا کے ذریعہ اقبالؔ سے ملنے کی خواہش ظاہر کی تھی جسے اقبال نے قبول کر لیا تھا۔ اور ۲۷ رنومبر ۱۹۳۳ء کو ملاقات کے دوران اقبال کی زبان سے ایک پیغام سنا تو وہ انگشت بدنداں رہ گیا اور کرسی چھوڑ کر کھڑا ہو گیا۔ اور میز پر ہاتھ پٹکتا ہوا چلاّنے لگا۔

"What an excellent idea :

What an excellent idea"

دنیا کے مشہور فلسفی اور مفکر ''برگساں'' نے جب اقبالؔ کی زبانی یہ حدیث سنی کہ "لا تسبرّ الدھر انّ الدھر ھو اللہ۔" (زمانے کو برا مت کہو کہ زمانہ خود خدا ہے) تو وہ جوگٹھیا کا مریض تھا اور کرسی کے بغیر اِدھر اُدھر ہل ڈُل نہیں سکتا تھا، کرسی چھوڑ کر آگے بڑھا اور علاّمہ اقبال سے پوچھنے لگا:

''کیا یہ واقعی حدیث ہے۔''

یہ امر خاص طور پر قابلِ ذکر ہے کہ برگساں اپنی بیماری کی وجہ کر بالکل گوشہ نشیں ہو گیا تھا اور کسی سے ملتا جلتا نہیں تھا۔ لیکن اقبال سے ملنے کے لئے، اس نے خاص طور پر اہتمام کیا۔

Scanned by CamScanner

یہ تمام باتیں ایسی ہیں، جو علامہ اقبالؔ کی بین الاقوامی شہرت و مقبولیت کا مظہر ہیں۔ لیکن باوجود اس کے اردو کے معروف ناقد کلیم الدین احمد کا اقبال کے متعلق یہ خیال ہے کہ۔

''اقبال کا عالمی ادب میں کوئی مقام نہیں۔''

اور ان کے بعد اسی ہندوستان کے مشہور شاعر فراقؔ گورکھپوری فرماتے ہیں کہ۔

''اخلاقی یا روحانی حیثیت سے اثر انداز ہونے والی شخصیت کی فہرستوں میں بھی ڈھونڈنے سے ڈاکٹر اقبال کا نام نہیں ملے گا۔'' مگر اسی کے ساتھ ساتھ انھوں نے یہ بھی اعتراف کیا ہے کہ ''دنیا کے بڑے بڑے شاعروں کے یہاں جو خوبیاں ہیں، وہ اقبال کے یہاں بھی موجود ہیں۔'' لیکن کلیم الدین احمد کے اس خیال کو کہ۔ ''اقبال کا عالمی ادب میں کوئی مقام نہیں'' تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔ اگر ایسی بات ہوتی تو اقبال کے کلام کا عرب کے ڈاکٹر عبدالوہاب عزائم، عراق کے امیر نورالدین، شام کے عمیر الامیری، مصر کے صادی شعلان، یمن کے ابین زبیری وغیرہ اپنے اپنے ملک کی ترقی یافتہ زبانوں میں ترجمہ نہیں کرتے یا پھر دنیا کی بڑی زبانوں میں اقبال پر کتابیں نہ لکھی جاتیں۔ بقول ڈاکٹر عالم خوندیری:

''ان کی (اقبالؔ کی) پہلی قابلِ ذکر اور معرکتہ الآراء شعری فکری تخلیق ''اسرارِ خودی'' منظر عام پر آئی تو اس نے اپنے دور کے سب سے زیادہ مستند اور عظیم مغربی مستشرق کو اس حد تک متاثر کیا کہ انھوں نے اس کی اشاعت کے دو برس بعد اس کا انگریزی ترجمہ شائع کر دیا۔''

نکلسن فرماتے ہیں :

''اقبالؔ صرف اپنے عصر کی آواز نہیں بلکہ اپنے دور سے آگے بھی ہیں اور ساتھ ہی اپنے زمانے میں برسرِ جنگ بھی۔''

اس کے بعد نکلسن کے شاگرد اور جانشیں آرتھر آربیری نے اقبالؔ کی چند شعری تخلیقات کا انگریزی میں ترجمہ کیا، جو ۱۹۴۷ء میں شائع ہوا اور بعد ازاں آرتھر آربیری نے ''رموزِ بےخودی'' و ''شکوہ اور جوابِ شکوہ'' اور ''جاوید نامہ'' کے انگریزی ترجمے دنیا کے سامنے پیش کئے۔ پھر براؤن نے بھی فارسی ادب پر کتاب لکھی۔ ''بوزانی'' نے جاوید نامہ کو اطالوی قالب میں ڈھالا۔ اور اقبالؔ اور دانتے کا موازنہ بھی کیا۔ یورپ کی دوسری اہم زبان ولندیزی میں بھی

Scanned by CamScanner

''جاوید نامہ'' کا نثری ترجمہ MEYEVOVITCH نے کیا۔انہوں نے اقبالؔ کے خطبات کا بھی فرانسیسی زبان میں ترجمہ کیا ۔ M E Y E V O V I T C H کے علاوہ LUCECLALIDE نے بھی اقبالؔ کو روشناس کرایا۔اور فرانسیسی ترجمے کا پیش لفظ مشہور و ممتاز مستشرق ''مسینون'' نے لکھا۔

بون یونیورسیٹی کے ماہر اسلامیات پروفیسر اناماری شمل نے اقبالؔ کی بعض تخلیقات کا ترجمہ جرمن زبان میں کیا ۔اقبالؔ پر پروفیسر شمل کی بہترین تصنیف Gabriels Wing ہے۔ان زبانوں کے علاوہ مشرقی یورپ اور سوویت یونین کی زبانوں میں بھی مثلاً چیک زبان میں چیک عالم ''یان مارک'' اور روسی زبان میں روسی عالم ''انی کیار'' نے بھی اقبالؔ کی تخلیقات کا ترجمہ کیا۔مختصر یہ کہ مندرجہ بالا حقائق اقبالؔ کی عالمی شہرت،عظمت اور مقبولیت کے واضح ثبوت ہیں۔

Scanned by CamScanner

سیماب اکبر آبادی

نام : عاشق حسین

تخلص : سیماب

ولادت : جون ۱۸۸۰ء، اکبر آباد، موجودہ آگرہ

وفات : ۳۱ر جنوری 1951ء، کراچی

نام والد : مولوی محمد حسین

مشغلہ : ادبی صحافت۔ تصنیف و تالیف

تصنیفات :

(۱) ساز و آہنگ (نظمیں) ۱۹۴۱ء

(۲) سدرۃ المنتہیٰ (غزلیں) ۱۹۴۶ء

(۳) شعر انقلاب (نظمیں) ۱۹۴۷ء

(۴) عالم آشوب (تاریخی رباعیاں) ۱۹۴۳

(۵) کار امروز (نظموں کا اوّل مجموعہ) ۱۹۳۴ء

(۶) کلیم عجم (غزلوں کا اوّل دیوان) ۱۹۳۶ء

(۷) لوح محفوظ (غزلوں کا تیسرا دیوان) ۱۹۷۹ء

(۸) نیستاں (نظمیں) ۱۹۲۵ء

(۹) دستور الاصلاح (فن اصلاح پر کتاب) ۱۹۴۰ء

(۱۰) راز عروض (عروض پر اہم کتاب) ۱۹۲۳ء

نوٹ: سیماب نے کلیم عجم میں ''شعر الحیات'' کے تحت اپنی تصنیفات و تالیفات کی تعداد ۲۸۴ لکھی ہے۔

Scanned by CamScanner

سیماب اکبرآبادی : ایوان غزل کا منفرد شاعر

سیمابؔ اکبرآبادی کا شمار بیسویں صدی کے اوائل کے ان شعراء میں ہوتا ہے جنہوں نے مختلف اصناف سخن مثلاً غزل، نظم، قصیدہ، رباعی، مثنوی، مرثیہ، سلام، نوحہ اور نعت وغیرہ میں فکری وفنی التزام کے ساتھ کامیاب اور صحت مند تجربے کر کے شہرت اور مقبولیت حاصل کی ہے۔

میخانۂ سخن کا گدائے قدیم ہوں
ہر رنگ کی شراب پیالے میں ہے مرے
(سیمابؔ)

سیمابؔ غزل کے سلسلے میں ہمیشہ تذبذب کے شکار رہے۔ اس کی وجہ میرے خیال میں اس وقت ایک جانب غزل کی مقبولیت اور دوسری طرف حالیؔ وغیرہ کی مخالفت تھی جس کی بنا پر سیمابؔ کہتے نظر آتے ہیں کہ

''ایک غزل کی جامعیت بعض اوقات ہزاروں نظموں سے بڑھ جاتی ہے۔''
(کلیم عجم۔ خطبات،۲)

دوسری طرف سیمابؔ کا یہ خیال بھی ملتا ہے کہ ـــــــ

''میں غزل میں پاکیزہ تغزل کا مخالف نہیں، لیکن شاعری کو محض تغزل تک محدود رکھنا بھی نہیں چاہتا، میں جانتا ہوں کہ اردو شاعری میں غزل اس وقت ایک مدقوق مریضہ کی حیثیت رکھتی ہے اور اندیشہ ہے کہ اگر اسے صحیح صورت میں زندہ رکھنے کی کوشش نہیں کی گئی تو وہ

Scanned by CamScanner

ہمیشہ کے لئے فنا ہو جائے گی۔"

اس کے بعد سیماب اپنے خیال کو بھی رد کرتے ہیں اور فرماتے ہیں:

"میں نظم کو غزل پر ترجیح دیتا ہوں اور چاہتا ہوں کہ شعراء غزل سے زیادہ نظم گوئی کی طرف متوجہ ہوں۔ اس لئے کہ غزل جس چیز کا نام ہے، وہ اپنی قدامت و کہنگی کی وجہ سے اب زیادہ کارآمد نہیں رہی۔ شعراء متقد مین اس صنف کو بہ تمام و کمال پامال اور ختم کر چکے ہیں ــــ منتہیٰ شعراء کے لئے بھی غزل میں اجتہاد ایجاد کی گنجائش بہت کم باقی ہے۔ مگر نظم کا میدان ہنوز وسیع ہے۔ اور یہ صنف سخن اردو شاعری کو کارآمد اور مفید بنا سکتی ہے اس لئے زیادہ تر توجہ اس کی طرف ہونا چاہئے۔"

سیماؔب نظم کو غزل پر کیوں ترجیح دیتے ہیں اس کی وجہ سیماؔب کے عہد کی غزلوں کے مطالعہ سے واضح ہو جاتی ہے۔ اور ان اسباب کا بھی پتا چلتا ہے، جن کے باعث سیماب نے غزل کو قدامت پسند صنف سخن ٹھہرایا اور اس کی جانب توجہ نہ دینے کی تلقین کی۔

سیماب جس عہد میں سانس لے رہے تھے اس عہد اور اس زمانہ میں انسان مختلف قسم کے مسائل سے دوچار تھا۔ غلامی کا طوق گلے میں تھا۔ عزت وقار، خاندانی روایتیں اور قدریں دم توڑتی نظر آرہی تھیں۔ روزی روٹی کا مسئلہ عفریت کی طرح سامنے کھڑا تھا۔ انقلابی طاقتیں بھی سر ابھار رہی تھیں۔ ان حالات میں ہمارے شعراء جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ وقت کا نباض ہوتا ہے۔ وہ حسن و عشق، جام و صبو اور شمع و پروانہ کی باتیں اپنی غزلوں میں کر رہے تھے۔ اس امر کو ایک حساس شاعر کیونکر برداشت کر سکتا تھا۔ اس لئے سیماب یہ کہنے پر مجبور ہوئے کہ ــــ

"ایک شاعر اگر اسے اپنے فرض کا احساس ہے اور وہ زمانہ کا نبض شناس ہے تو ہزاروں نبرد آزما جوانوں سے بہتر ہے۔"

سیماؔب ہمیشہ شاعری میں صحت مند رویے کے پیرو کار رہے اور وہ چاہتے تھے کہ وہ دوسرے شعراء خواہ وہ ان کے ہم عصر ہوں یا ان کے شاگرد، شاعری میں حسن و عشق، گل و

بلبل، شمع و پروانہ اور جام وسبو وغیرہ جیسے پرانے اور روایتی موضوعات کو جگہ دے کر صرف تفریح کا ذریعہ نہ بنائیں بلکہ وقت کے اہم تقاضوں کو سمجھیں اور بلند خیالی اور بلند نگاہی کے ساتھ ساتھ اپنے مشاہدے اور مطالعے کا ثبوت دیتے ہوئے اول درجہ کی شاعری کا نمونہ پیش کریں اور شاعری کے وقار اور عظمت کو بلند کریں۔ گیا (بہار) میں منعقدہ ۲۴ر دسمبر ۱۹۲۲ء کے ایک مشاعرے میں اپنے پہلے خطبہ میں سیماب نے ان ہی باتوں کی جانب اشارہ کیا تھا۔

''اردو شاعری کی اجزائے ترکیبی جب تک صرف گل و بلبل، شمع و پروانہ، سرو قمری اور شانہ و زلف سے وابستہ رہے، شاعری کو صرف تفریح کی خاطر ایک ذریعۂ مسرور سمجھی گئی۔ لیکن قدرت نے لکھنؤ، دہلی اور پانی پت کے بعض فاضل عمائدین کے دماغ کو انوار شاعری سے تجلّی کر کے دنیائے سخن کی فضائے بسیط پر رشد و ہدایت کی بجلیاں چمکائیں۔''

لیکن ایسی بات بھی نہیں کہ ایسی شاعری جس کے سیمابؔ مخالف تھے، صرف غزلوں میں ہی پائی جاتی تھیں۔ بلکہ اس زمانے کی نظموں میں بھی اسی طرح کے اظہار جگہ پاتے تھے۔ پھر بھی غزل کی مقبولیت میں کمی نہیں آئی۔ جس وجہ کر سیمابؔ اس سلسلے میں برابر تذبذب میں مبتلا رہے اور خود بھی خوب سے خوب تر غزلیں کہتے رہے۔ لیکن اس احتیاط کے ساتھ کہ ؎

شگفتِ خاطر اے سیمابؔ تھی جو شاعری پہلے
طبیعت پر وہ اب اک بار سا معلوم ہوتی ہے

سیمابؔ کی غزلیں ''کلیم عجم''، سدرۃ المنتہیٰ سے ''لوح محفوظ'' تک پہنچتے پہنچتے ان کے فکر و خیال کی بلندی، احساسات و جذبات کی رنگا رنگی، حیات و کائنات کی تنقید، تفسیر اور تعبیر تمام ترفنی بالیدگیوں کے ساتھ نظر آنے لگی تھیں اور اپنے مخصوص اور منفرد لب و لہجہ کی وجہ کر اپنے ہم عصر شعراء میں بہت زیادہ شہرت اور مقبولیت حاصل کر چکی تھی۔ جس سے ان کے ہم عصر شعراء کو حسد کا موقع ملا۔ خاص طور پر سیمابؔ کی غزل کا ایک شعر ؎

وہ سجدہ کیا رہے احساس جس میں سر اٹھانے کا
عبادت اور بقید ہوش توہین عبادت ہے

اس سے مخالفت بڑھی اور ان کے ہم عصروں کو موقع ملا کفر کا فتویٰ صادر کرنے کا۔ لیکن سیماب نے کبھی ان سب باتوں کی پرواہ کی اور نہ ان فضولیات میں پڑے۔ بلکہ اپنے فکروفن، احساس وجذبات، مطالعہ ومشاہدہ سے اردو شاعری کا دامن بھرتے رہے۔

''کلیم عجم'' اور سدرۃ المنتہیٰ'' سے ''لوح محفوظ'' تک سیماب اکبرآبادی کی غزلیہ شاعری کا سفر خاصا طویل رہا ہے اور اس طویل سفر کا جائزہ لیا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ آج جو غزلوں کا مزاج اور معیار بدلا ہوا دیکھنے کو مل رہا ہے اس کا کریڈٹ کسی حد تک سیماب کو جاتا ہے کیونکہ سیماب نے ہمیشہ ایسی غزلوں کی مخالفت کی جو صرف تفریح طبع کے لئے کی جاتی رہیں اور عصری مسائل اور عصری تقاضوں سے لاتعلق رہیں اس کے برعکس سیماب نے اپنے اردگرد کے حالات کا بغور مطالعہ ومشاہدہ کیا۔ اور انہیں اپنی غزلوں میں ایک نئے رنگ وآہنگ کے ساتھ پیش کیا۔ اسی لئے برسوں قبل کہے ہوئے سیماب کے اشعار آج کے شاعرانہ مزاج کی نمائندگی کررہے ہیں۔ اس ضمن میں چند اشعار ملاحظہ فرمائیں ۔

کہانی میری روداد جہاں معلوم ہوتی ہے
جو سنتا ہے اسی کی داستاں معلوم ہوتی ہے
دبا رکھا تھا جس کو ضبط نے غربت کے سینے میں
وہ شورش اب جہاں میں جابجا معلوم ہوتی ہے

☆

ہیں اب آزاد مثلِ نکہت و رنگ چمن ہم بھی
وطن کو چھوڑ کر سمجھے ہیں مفہوم وطن ہم بھی

☆

جسے نہ تجربہ ہو رنج نا رسائی کا
وہ کارواں میں میرے پیر کارواں نہ بنے

☆

کل کسی قافلے میں جن کا نہ تھا کوئی مقام
آج وہ قافلہ سالار نظر آتے ہیں

Scanned by CamScanner

تغیرات ہیں مجھ میں بھی زندگی کی طرح
کبھی کسی کی طرح ہوں ، کبھی کسی کی طرح

☆

بھلادوں کس طرح سیمابؔ صد سالہ تعلق کو
مرا سرمایۂ ماضی ابھی ہندوستان میں ہے

☆

کہاں ہے سیمابؔ کا وہ دل اب جو اس کے پہلو میں جستجو کی
گھٹا ہوا سا دھواں ملے گا ، اڑی ہوئی خاک میں ملے گی

☆

پھیلے تو یوں کہ چھاگئے کل کائنات پر
سمٹے تو اس قدر کہ اک جاں میں رہ گئے

☆

نہیں جس میں تحمل مشکلات راہ منزل کا
وہ پچھتائے گا اے سیمابؔ میرا ہم سفر ہوکر

☆

مجھے کیوں انقلاب حال پر سیمابؔ حیرت ہو
کہ ایسے انقلاب آتے رہتے ہیں ہر زمانے میں

☆

شعر یوں کہتا ہے بے فکر و تکلف سیمابؔ
جیسے اس شخص کو الہام ہوا کرتا ہے

☆

بہت سارے ایسے اشعار سیمابؔ کی غزلوں میں ملتے ہیں جو انقلابیت، وطن دوستی، ترک وطن کا کرب، وطن کی یاد، دوستوں کی رفاقت، حیات وکائنات کے اسرار ورموز، خدا کی

Scanned by CamScanner

قدرت اوراس کی کرشمہ سازیاں وغیرہ جیسے اہم موضوعات میں رومانیت واشاریت کا حسین امتزاج موجود ہیں۔

سیمابؔ کی ابتدائی غزلوں میں رومانیت اور مناظرِ فطرت کی ایسی کیفیات پوری شدت کے ساتھ ملتی ہیں، جس میں جذباتیت بھی ہے اور احساس کی رنگینیاں بھی۔لیکن عریانیت یا عامیانہ اور سطحی باتوں کا کہیں پر بھی دخل نہیں ہے۔اس سے سیمابؔ نے ہمیشہ پرہیز کیا۔ ؎

وقت تنہائی میں مشکل سے کٹے
تیرے وعدوں کا سہارا گر نہ ہو

☆

مطمحِ عشق کہاں حسن کم آویز کہاں
آپ کرتے ہیں وفا، شرم مجھے آتی ہے

☆

حُسن دنیا میں ہے جب تک باقی
ترک دنیا مری نیّت میں نہیں

☆

جیسے جیسے سیمابؔ کا شعور بالیدہ ہوتا گیا، وہ عصری تقاضوں اور سماجی، سیاسی اور معاشی مسائل سے رشتہ جوڑنے لگے اور بھرپور اشعار زندگی کی تمام تر نزاکتوں اور لطافتوں کے ساتھ پیش کیا۔اوراس پیشکش میں نئی ترکیبوں، اصطلاحوں، تشبیہوں اور استعاروں سے بھی کام لیا اور اشارے کنائے، بامعنی محاورے اور علامتوں کا استعمال کر کے ایوان غزل میں منفرد اور معتبر مقام بنایا!

Scanned by CamScanner

فراق گورکھپوری

نام : رگھوپتی سہائے
تخلص : فراقؔ
ولادت : ۲۸؍اگست ۱۸۹۶ء (گورکھپور)
وفات : ۳؍مارچ ۱۹۸۲ء (الہ آباد)
نام والد : منشی گورکھ پرساد "عبرت"
تعلیم : ایم۔اے (انگریزی)
مشغلہ : انگریزی کے پروفیسر الہ آباد یونیورسٹی
شعری تصنیفات:

شعری مجموعے

۱۔شعلہ ساز
۲۔روپ
۳۔شبنمستان
۴۔غزلستان
۵۔چراغاں
۶۔دھرتی کی کروٹ
۷۔روح کائنات
۹۔بہارستان
۱۰۔گل نغمہ (۱۹۵۹ء میں شائع اس شعری مجموعہ پر ساہتیہ اکادمی کے کے علاوہ ۱۹۷۰ء میں گیان پیٹھ ایوارڈ ملا)

Scanned by CamScanner

فراق گورکھپوری غزل کی آبرو

اردو شاعری کی آبرو اگر غزل ہے تو غزل کی آبرو فراق ہیں۔ انہوں نے اردو غزل کو نیا انداز، نیا لب ولہجہ اور نئی قدروں سے روشناس کرایا۔ خاص طور پر رومانی اور عشقیہ شاعری میں مطالعہ ومشاہدہ کی گہرائی وگیرائی اور خیالوں کا نیا پن، لب ولہجہ میں بے ساختگی، حسن وعشق، وصل وہجر۔ وفا اور جفا کی بیشتر داستانیں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ ان میں فراق نے ایک نئی روح پھونک دی ہے اور تکلف وتصنع کو ختم کر کے ایسی سادگی، شادابی اور شگفتگی بخشی کہ وہ پوری اردو غزل پر چھا گئے اور جس غزل کو کلیم الدین احمد نے آرام کا مشورہ دیا تھا۔ وہ اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ سامنے آئی اور فراق کے کلام کو دیکھ کر کلیم الدین احمد کو یہ کہنا پڑا کہ:

> ''ان (فراق) کے شعروں میں خیالات کی گہرائی ہے، وہ زندگی اور محبت کے نکات پر ''تبصرے'' کرتے ہیں، اور اتنا لطیف وعمیق کرتے ہیں کہ شاعری سے علیٰحدہ ایک مستقل لذت محسوس ہونے لگتی ہے۔''

دلچسپ بات یہ ہے کہ کلیم الدین احمد نے فراق گورکھپوری کی غزلوں کے بارے میں اس زمانہ میں یہ خیالات ادا کئے جب فراق کی غزل گوئی بالیدگی کی سرحدوں میں داخل نہیں ہوئی تھی، اور وہ ندرت اور کیفیت پیدا نہیں ہوئی تھی جنہیں آج شدت کے ساتھ محسوس کیا جا رہا ہے۔

فراق کی غزلوں میں دو عناصر نمایاں طور پر نظر آتے ہیں اوّل حسن وعشق کی کیفیتیں اور دوئم درد وکرب کا احساس۔

فراق رومان پسند اور حسن پرست تھے جس نے ان سے کئی عشق کرائے، عشق میں

Scanned by CamScanner

انہوں نے حسن کو قریب سے دیکھا، اس کے لمس کو محسوس کیا اور پھر وفا اور جفا کے مرحلوں سے دو چار ہوئے۔ اس لئے جہاں ایک طرف حسن کی گرمی نے انہیں سکون، اطمینان اور راحت پہنچائی تو دوسری طرف محبوب کی بے وفائی نے انھیں آٹھ آٹھ آنسو رُلایا۔ تڑپایا اور بے قرار کیا۔ فراق نے اپنے ایک خط میں اپنے کئی عشق کا ذکر اس طرح کیا ہے :

پہلا عشق ۱۲ دسمبر ۱۹۱۴ء کو ہوا جو چند ہفتوں کی خوشگواریوں کے بعد ناقابلِ برداشت ناکامی میں تبدیل ہو گیا اور یہ پہلا عشق دس بارہ برس تک مسلط رہا۔

دوسرا زبردست عشق ڈیڑھ برس تک رہا پھر کسی ان بن یا ناخوشگواری کے بغیر ہم دونوں کو ایک دوسرے سے جدا ہونا پڑا۔

تیسرا عشق کئی برس بعد ہوا (تقریباً ۱۹۲۹ء میں) جو اندازاً سال بھر اسی طرح چلتا رہا کہ کبھی انتہائی خوشی اور کبھی انتہائی ناکامی۔

اس کے تین برس بعد ایک زبردست عشق ہوا جس میں اندازاً سال بھر خوش رہ کر بعد میں آٹھ آٹھ آنسو رونے کی نوبت آئی۔

پھر سات برس کے بعد ایک بہت زبردست عشق ہوا جو پانچ یا چھ ماہ تک خوشگوار رہ کر ایک مستقل عذاب میں بدل گیا۔ ''شام کی عبادت'' اسی عشق کی دین ہے۔

اس کے بعد میرا موجودہ رومان ۱۹۵۰ء میں شروع ہوا اور یہ رومان شدید ہونے کے بجائے گہرا اور خاموش ہے اور جذبۂ محبت بہت مستقل اور متوازن ہے۔ ہوتا یہ رہا کہ جب کسی معشوق سے تعلقات ٹوٹنے لگے یا ٹوٹ گئے ہیں تو ایک لمبے وقفے کے لئے کسی اور سے محبت کرنا ناممکن ہو جاتا تھا۔ بچھڑے ہوئے معشوق کو بھلائے بغیر بھی جھک مار کر یا آزمایشاً کچھ لوگوں سے میں نے

Scanned by CamScanner

محبت کی ہے لیکن یہ تجربے قبل از وقت ہوتے تھے۔''

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ فراقؔ نے اپنی حسن اور رومان پسندی اور پرستی کی وجہ سے کئی عشق کئے ۔اور جو بھی عشق کیا وہ بقول فراقؔ ''زبردست''''شدید''اور''گہرا'' کیا۔

اس لئے ان زبردست، شدید، اور گہرے عشق کا اثر بھی فراق کے دل ودماغ نے ''زبردست''، ''شدید'' اور'' گہرا'' قبول کیا ۔

تم مخاطب بھی ہو قریب بھی ہو
تم کو دیکھیں کہ تم سے بات کریں

☆

جسم نازنیں میں سرتا پا نرم لویں لہرائی ہوئی سی
تیرے آتے ہی بزم ناز میں جیسے کئی شمعیں جل جاتیں

☆

کون اے دوست اتنا پیارا ہے
ہم سوا تیرے کس کو پیار کریں

☆

دل میں یوں بیدار ہوتے ہیں خیالات غزل!
آنکھیں مَلتے جس طرح اٹھے کوئی مست شباب

☆

قیامت ہے کہ کہسار پہ چڑھتا ہوا دن ہے
جوبن ہے کہ چشمۂ خورشید میں طوفان

☆

چپکے چپکے اٹھ رہا ہے مد بھرے سینوں میں درد
دھیمے دھیمے چل رہی ہے عشق کی پروائیاں

☆

حیات ہے محبت سر بہ سر محبت   محبت زندگی کا دوسرا نام ہے

Scanned by CamScanner

شاخِ گل جس طرح ہوا سے مُڑے
یاد ہے تیرے روٹھنے کی ادا

☆

کوئی سمجھے تو ایک بات کہوں
عشق توفیق ہے گناہ نہیں

فراقؔ جب عشق کی گرمی، حسن کی شعلگی کو قریب سے دیکھنے، محسوس کرنے اور پھر لمس کے حدود سے بھی آگے بہت آگے بڑھ جاتے تو وہ اس کی قربت اور خودسپردگی کے مشاہدے اور تجربے کی روشنی میں اس کا اظہار یوں کرتے ہیں ۔

ذرا وصال کے بعد آئینہ تو دیکھ اے دوست
تیرے جمال کی دوشیزگی نکھر آئی

☆

جسم اس کا نہ پوچھئے کیا ہے
ایسی نرمی تو روح میں بھی نہیں ہے

☆

تیرا جمال ہے یا نغمۂ بہشت کی لے
کہ آج تک تو نہ دیکھا تھا یہ بدن کا رچاؤ

☆

جہاں پڑتی ہیں آنکھیں اس بدن پر
تبسم ہائے پنہاں دیکھتا ہوں

☆

اے جسم نازنیں نگار نظر نواز
صبح شب وصال تیری ملگجاہٹیں

اس کے بعد جب فراقؔ کو محبوب کی بے وفائی کا سامنا کرنا پڑتا ہے تو اس کی یادیں،

Scanned by CamScanner

درد، کرب، گھٹن اور تڑپ بن کر دل کو بے چین اور بے قرار کرتی ہیں پھر دل کی گہرائیوں سے ایسے اشعار نکلتے ہیں جن میں سوز و گداز، درد و کرب، احساس کی تڑپ، جذبات کا بکھراؤ تمام تر فنی رچاؤ کے ساتھ دیکھنے کو ملتے ہیں۔

کوئی افسانہ چھیڑ تنہائی　　رات کٹتی نہیں جدائی کی

☆

کیا بزم دوستاں تھی ابھی کل کی بات ہے
معلوم ہو رہا ہے کہ صدیاں گزر گئیں

☆

پھر یہ کیسی کسک سی ہے دل میں　　تجھ کو مدت ہوئی کہ بھول چکا

اتنا نہ ہو بے قرار اے دل　　خود کو بھی تو کچھ سنبھالتے ہیں

☆

یارب جو یہ دی سزائے ہستی　　آخر کوئی قصور میرا

☆

تم اپنے جور کو دینا نہ الزام　　یہ آنسو اتفاقاً آ گئے ہیں

☆

یوں تو رونے سے کچھ نہیں ہوتا　　جی نہیں مانتا تو کیا کیجئے

☆

طبیعت اپنی گھبراتی ہے جب سنسان راتوں میں
ہم ایسے میں تری یادوں کی چادر تان لیتے ہیں

☆

غرض کہ کاٹ دیئے زندگی کے دن اے دوست
وہ تیری یاد میں ہوں یا تیرے بھلانے میں

یہ تمام اشعار ایسے ہیں جن سے فراقؔ کی دردناکی اور کربناکی کا اظہار ہوتا ہے۔

Scanned by CamScanner

میں یہ بیان کر چکا ہوں کہ فراقؔ کی غزلوں میں دو عناصر نمایاں ہیں، حسن وعشق اور درد وکرب، لیکن حسن وعشق کی جو کارفرمائیاں ہیں وہ تو ہیں ہی۔ درد وکرب جو فراقؔ کی زندگی میں پوری طرح سرایت کیا، اس کے دو نمایاں سبب نظر آتے ہیں۔ اول تو محبوباؤں کی بے التفاتی کا غم اور دوئم فراقؔ جیسے حسن اور رومان پرست اور حساس انسان کی شادی ایک بدصورت ان پڑھ لڑکی سے ہونا۔ جس نے پیغام مسرت دینے کے بجائے عمر بھر کے لئے فراقؔ کو ایک روگ میں مبتلا کر دیا اور اس روگ کو فراقؔ عمر بھر ڈھوتے رہے جھیلتے رہے چاہتے تو وہ اس روگ سے بآسانی چھٹکارا حاصل کر سکتے تھے لیکن فراقؔ کے اندر کے انسان نے ایسا کرنے سے باز رکھا۔ فراق خود اس کا اظہار یوں کرتے ہیں۔

> ''میری شادی نے زندگی کو ایک زندہ موت بنا کر رکھ دیا۔ زندگی کے عذاب ہو جانے کے باوجود میں نے خودکشی نہیں کی، نہ پاگل ہوا، نہ جرائم پیشہ بنا، نہ زندگی کی ذمہ داریوں سے دست بردار ہوا۔ اس لئے شدید حسن پرستی کے باوجود زندگی کی شرافت کی جو قدریں مان چکا تھا ان کا میں نے سہارا لیا......''
>
> ''بیوی کو مستقل طور پر اس کے میکے بھیج دینا یہ بھی بڑا ظلم معلوم ہوتا تھا۔ اس لئے ساتھ رہنا اور برابر غصہ اور نفرت، بے دلی اور بد دلی کے ساتھ جیتے رہنا میرے حصے میں آیا۔''

(نیا دور، فراق نمبر، عبدالقوی دسنوی)

فراقؔ کے حصے میں اس طرح درد وکرب، گھٹن واضطراب زیادہ آیا۔ بہ نسبت لمحاتی مسرتوں اور خوشیوں کے۔ اور فراق اپنی پوری زندگی انھیں لمحاتی خوشیوں اور مسرتوں کو سینے سے لگائے جیتے رہے۔ اور بقول کلیم الدین احمد:

> ''حسرتؔ و فانیؔ کی طرح فراقؔ کا دل بھی زخمی ہے اور ان کی آواز بھی درد بھری ہے۔ لیکن وہ بھی حسرت کی طرح کبھی آواز بلند نہیں کرتے۔ چیخ و پکار سے پرہیز کرتے ہیں اور اپنی درد بھری داستانوں کو نرم، دھیمی، شیریں آواز میں بیان کرتے ہیں۔ درد کی

Scanned by CamScanner

شدت میں وہ بھی اپنی آواز پر قابو رکھتے ہیں اور اسے بلند آہنگ نہیں ہونے دیتے ہیں۔"

حقیقت تو یہ ہے کہ فراؔق کے اوپر دکھ درد کے پہاڑ اتنی بار ٹوٹے، اتنی بار ان سے واسطہ پڑا کہ انھیں اپنے دکھ، درد، کرب، گھٹن اور غم سے بھی پیار ہو گیا اور وہ عمر بھر انہیں خوشی خوشی جھیلتے رہے، بلکہ یہاں تک کہنے پر مجبور ہوئے کہ ؎

سوزِ غم سے نہ ہو جو مالا مال
دل کو سچی خوشی نہیں ملتی

☆

وہ تو کوئی خوشی نہیں جس میں
درد کی چاشنی نہیں ملتی

☆

یہ تو نہیں کہ غم نہیں
ہاں مری آنکھ نم نہیں

☆

غرض کہ کاٹ دیئے زندگی کے دن اے دوست
وہ تیری یاد ہو یا تیرے بھلانے میں!

☆

اکثر شبِ ہجر دوست کی یاد   تنہائی کی جان ہو گئی ہے

یہ تو ہوئی باتیں فراؔق کی اچھی اور کامیاب غزل گوئی کے محرک کی۔ اب آیئے دیکھیں کہ وہ کون سی خصوصیات ہیں جن کے سبب فراؔق یہ کہنے پر خود مجبور ہوئے کہ ؎

ختم ہے مجھ پہ غزل گوئی دورِ حاضر کی
دینے والے نے وہ اندازِ سخن مجھ کو دیا

Scanned by CamScanner

سن لو کہ فراقؔ آج یہاں گرم نوا ہے
اس دور میں اقلیم سخن کا وہ شہنشاہ

☆

غالبؔ، میرؔ، مصحفیؔ ہم بھی فراقؔ کم نہیں

عصر حاضر میں اگر فراقؔ کی عظمت غالبؔ، میرؔ اور مصحفیؔ سے زیادہ نہیں ہے تو کم بھی نہیں۔ اس لئے کہ فراقؔ جب حسن و عشق کو الفاظ کے ذریعے شعر کا روپ دیتے ہیں تو حسن و عشق اپنی تمام تر جلوہ سامانیوں، عشوہ طرازیوں، نزاکتوں اور لطافتوں کے ساتھ جلوہ گر ہوتی ہیں اور آنکھوں کے سامنے ایک نقشہ سا گھوم جاتا ہے۔ اور ایسا سحر پیدا ہوتا ہے، ایسی کیفیت طاری ہوتی ہے کہ بس ''شعلہ سا لپک جائے ہے انداز تو دیکھو'' کا تاثر پیدا ہوتا ہے اور جب فراقؔ درد وغم، کرب اور گھٹن کو موضوع سخن بناتے ہیں تو دل ودماغ، ذہن سبھوں کو جھنجھوڑ کر رکھ دیتے ہیں۔ اور ایسا اثر آگیں احساس پیدا ہوتا ہے کہ قاری ان میں ڈوب کر رہ جاتا ہے اور بے اختیار فراق سے ہمدردی کا جذبہ ابھرنے لگتا ہے اور یہ اس لئے بھی ہوتا ہے کہ فراقؔ کے جذبے کی صداقت، احساس کی شعلگی، مشاہدے کی گہرائی اور مطالعے کی گیرائی کے ساتھ ساتھ نادر تشبیہہ، استعارے، علامتیں اور اشارے دکنائے میں بڑی سادگی لیکن پرکاری کے ساتھ بغیر کسی تکلف اور تصنع کے ساتھ سامنے آتی ہیں جو سیدھے دل میں اترتی چلی جاتی ہیں۔

فراقؔ کی ان خصوصیتوں کا ذکر اردو ادب کے تقریباً تمام اہم اور معتبر ناقدوں نے کیا ہے۔ پروفیسر احتشام حسین لکھتے ہیں:

> ''اگر احساسات کی لطافت، جذبات کی شدت اور حسن اظہار کی ندرت غزل میں ایک جگہ دیکھنا ہو تو فراقؔ کی غزلیں دیکھنا چاہئے۔ وہ ان سب کا کیمیاوی امتزاج پیش کرتی ہیں۔''
>
> (شعرستان ص ۲)

فراقؔ نے ہمیشہ اپنے فکر واحساس کے اظہار کے لئے نیا انداز، نیا اسلوب اور بالکل نیا لب ولہجہ اپنایا۔ اور برابر ان کی یہ کوشش رہی ہے کہ وہ روایتی قسم کی فکر وخیال کے بجائے بالکل نئی

Scanned by CamScanner

فکر، نئے احساس کو اپنی غزلوں میں سموئیں جن میں سادگی، حسن اور شگفتگی کی رنگا رنگ کیفیت ہو۔
غزل کیسی ہونی چاہئے اس کی تعریف فراقؔ نے اس طرح بیان کی ہے :

"غزل انتہاؤں کا ایک سلسلہ ہے A Series of Climates یعنی حیات و کائنات کے وہ مرکزی حقائق جو انسانی زندگی کو زیادہ سے زیادہ متاثر کرتے ہیں۔ تاثرات کی انہیں انتہاؤں کا مترنم خیالات یا محسوسات بن جانا اور مناسب ترین یا موزوں ترین الفاظ و انداز بیان میں ان کی صورت پکڑ لینا اسی کا نام غزل ہے۔"

(حرمت الاکرام۔ نیا دور فراقؔ نمبر)

اپنے اس خیال پر فراقؔ ہمیشہ قائم رہے اور غزل کے پر تکلف اور تصنع بھرے انداز کو بدلا۔ اور نیا انداز، نیا لب و لہجہ اور مخصوص فکر و آہنگ سے اردو غزل کو روشناس کرایا جن سے متاثر ہو کر نیاز فتح پوری جیسا اردو ادب کا جید عالم اور ناقد یہ کہنے پر مجبور ہوا کہ :

"اگر مجھ سے پوچھا جائے کہ آج کے شعراء میں سب سے درخشاں مستقبل کس کا ہے تو میں تنہا فراق کا نام لوں گا۔ فراقؔ کی شاعری میں وہ لطافتیں اور نزاکتیں ہیں، جن سے زیادہ بہتر لطافتوں یا نزاکتوں کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا۔"

حقیقت یہ ہے کہ فراقؔ نے اپنی غزلوں کو اپنے گہرے مطالعے، عمیق مشاہدے، لطیف احساسات و جذبات، فکر و خیال اور فن کی ندرت، تازگی، شگفتگی، خوب صورت لب و لہجہ نادر تشبیہات، استعارات اور علامتوں کی جدت طرازیوں سے مالا مال کیا ہے۔ اور بے شک پوری ادبی دنیا میں فراقؔ کا نام میر، غالبؔ، مصحفیؔ اور حسرت وغیرہ کے بعد امر ہے اور امر رہے گا۔ فراقؔ کا یہ شعر جو حقیقت کا آئینہ دار ہے فراقؔ کی یاد دلاتا رہے گا۔ جو فراقؔ کی عظمت کا بھی نقیب ہے۔

آنے والی نسلیں تم پر رشک کریں گی ہم عصرو!
جب یہ دھیان آئے گا ان کو تم نے فراقؔ کو دیکھا ہے

☆☆

Scanned by CamScanner

جمیل مظہری

نام : سید میر کاظم علی
تخلص : جمیؔل
ولادت : ۴؍ستمبر ۱۹۰۴ء (پٹنہ) بمطابق میٹرک سرٹیفکٹ : یکم جنوری ۱۹۰۵ء
وفات : ۲۳؍جولائی ۱۹۸۰ء (مظفر پور)
نام والد : مولانا خورشید حسین
تعلیم : ایم۔اے (فارسی اور تاریخ)، کلکتہ یونیورسٹی
مشغلہ : پروفیسر شعبۂ اردو پٹنہ یونیورسٹی
تصانیف:

(۱) شکست و فتح (طویل افسانہ) ۱۹۵۰ء
(۲) نقشِ جمیل (نظمیں) ۱۹۵۳ء
(۳) فکرِ جمیل (غزلیات، گیت، رباعیات، قطعات) ۱۹۵۸ء
(۴) عرفانِ جمیل (مراثی، قصائد، سلام) ۱۹۶۹ء
(۵) آب و سراب (طویل فلسفیانہ مثنوی) ۱۹۷۰ء
(۶) وجدانِ جمیل (مراثی اور ملی نظمیں) ۱۹۷۸ء

rekhta

Scanned by CamScanner

جمیل مظہری کی شاعرانہ شناخت

جمیل مظہری کو شعروسخن کا ذوق ورثہ میں ملا۔ ان کے دادا سید مظہر حسین مرحوم مرزا دبیر کے خاص شاگردوں میں تھے اور مختلف اصناف سخن پر قدرت رکھتے تھے۔ جمیل مظہری کے والد مولانا سید خورشید حسن کا شمار بھی اس زمانے کے اچھے اور خوش گو شعرا میں ہوتا تھا اور انھوں نے بذات خود اپنے عزیز بیٹے سید کاظم علی (جمیل مظہری) کی شاعری کی رہنمائی کی۔ اس لئے کہ انہیں اس بات کا اندازہ ہو چکا تھا کہ جمیل مظہری کے اندر شاعرانہ صلاحیت بدرجہ اتم موجود ہے چونکہ جمیل مظہری چار پانچ سال کی عمر سے ہی شعر موزوں کرنے لگے تھے۔ اس لئے ان کے والد کا ایسا سمجھنا غلط نہیں تھا جمیل مظہری اس سلسلے میں لکھتے ہیں:

> ''والد صاحب سے سنا تھا اور کچھ کچھ مجھے یاد ہے کہ چار پانچ برس کی عمر میں بھی اتفاقاً کبھی کبھی مصرعے موزوں ہو جایا کرتے تھے، والد مرحوم انیس کے مرثیوں کو پڑھتے تو میں ان کی نقلیں اتارا کرتا اور نقلیں اتارتے ہوئے کچھ مصرعے میرے اپنے ہو جاتے، والد مرحوم کہتے تھے کہ بعض جملے میری زبان سے ایسے نکل جاتے جو موزوں ہوتے۔''

جمیل مظہری کی شاعری میں تھوڑی بالیدگی آنے لگی تو انھوں نے جمیل مظہری کو مولانا رضا علی وحشت کلکتوی کی شاگردی اختیار کرنے کا مشورہ دیا۔ جو جمیل مظہری کے کلام کا فنی اور لسانی اصلاح فرمادیا کرتے۔ لیکن تھوڑے ہی دنوں بعد اس کی بھی ضرورت نہ رہی۔ اس لئے کہ جمیل مظہری کی خداداد شاعرانہ صلاحیت کا اندازہ ان کے استاد کو بھی ہو گیا۔

آہستہ آہستہ جمیل مظہری نے اپنی محنت، لگن، کوشش اور گہرے مطالعے و مشاہدے سے تقریباً تمام اصناف سخن پر قدرت حاصل کرلیا اور غزلوں، نظموں کے علاوہ رباعیوں،

Scanned by CamScanner

مثنویوں، قصیدوں، ہجو، مرثیوں، گیتوں اور سلام وغیرہ جیسی اصناف شاعری پر طبع آزمائی کی اوران میں قابل قدر اضافے کئے۔

اس سے قبل کہ جمیل مظہری کی شاعری کا جائزہ لیا جائے، میں ضروری سمجھتا ہوں کہ جمیل مظہری کی زندگی کے حالات پر ایک نظر ڈالی جائے۔ اس لئے کہ میرے خیال کے مطابق کسی بھی فنکار کے افکار وخیالات کو سمجھنے اور پرکھنے کے لئے اس فنکار کے حالات زندگی کا سامنے ہونا نہایت ضروری ہے۔ تا کہ اس کا صحیح اندازہ ہو سکے کہ فنکار نے کن حالات میں اور کن واقعات سے متاثر ہو کر فکر وفن کے نمونے پیش کئے ہیں، اگر ایسا نہ ہوا تو پھر فنکار کے بہت سے فکر وفن لایعنی محسوس ہوں گے۔

جمیل مظہری ۱۹۰۵ء میں پیدا ہوئے۔ بچپن کا زیادہ تر حصہ عظیم آباد اور مظفر پور میں گذرا۔ ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد ۱۹۳۱ء میں کلکتہ یونیورسیٹی میں داخلہ لیا اور وہاں سے فارسی اور تاریخ میں ایم۔اے کیا۔ ایم۔اے کرنے کے بعد اردو صحافت سے منسلک ہو گئے۔ اس وقت ہندوستان کی سیاسی، سماجی اور معاشی صورت حال نازک موڑ پر کھڑی تھی۔ غلامی کی زنجیروں کو توڑ پھینکنے کی عملی جد و جہد زور پکڑتی جا رہی تھی۔ ایسے حالات میں ایک حساس شاعر کا حد درجہ متاثر ہونا عمومی بات تھی۔ چنانچہ جمیل مظہری بھی متاثر ہوئے اور اپنی شاعری سے لوگوں میں حوصلہ، جوش، ہمت اور ولولہ پیدا کرنے کی کوشش کرنے لگے۔ لیکن چونکہ جمیل مظہری کے ذہن نے مہاتما گاندھی کے عدم تشدد کے فلسفہ کو بھی قبول کیا تھا، اس لئے انہوں نے اپنی انقلابی شاعری یا ترانۂ آزادی میں گھن گرج کی بجائے سنجیدگی، متانت اور آزادی وانقلاب کے واضح تصور کو پیش کیا اس کے ساتھ ساتھ صحافتی میدان میں بھی انقلاب کا نعرہ بلند کرتے رہے۔ اس میں انہیں کئی بار نقصان بھی اٹھانا پڑا۔ لیکن انہوں نے کبھی اس کی فکر نہیں کی اور ہمیشہ اپنے موقف پر قائم رہے۔

اسی درمیان بقول جمیل مظہری :

> ''۱۹۳۷ء میں بہار کے محکمہ نشر واشاعت کے لئے ایک پبلسٹی آفیسر کی ضرورت ہوئی، پروفیسر عبدالباری مرحوم نے کلکتہ سے بلوا کر وزیروں کے سامنے مجھے پیش کیا اور اس زمانہ میں مولانا آزاد بھی

Scanned by CamScanner

آئے۔ انھوں نے بھی سفارش کی اور میں ۲؍دسمبر ۱۹۳۷ء میں
سرکاری ملازم کی حیثیت سے پبلسٹی کا کام کرنے لگا۔ ۱۹۳۹ء میں
جب وزارت نے استعفیٰ دیا تو میں راجندر بابو سے ملا، انہوں نے
کہا کہ ابھی لڑائی فائنل نہیں ہے۔ اس لئے ابھی آپ محکمہ میں
رہیں اور دیکھیں کہ کیا ہوتا ہے۔ ۱۲؍اگست ۴۲ء کو گاندھی جی گرفتار
کر لئے گئے تو میں نے اپنا استعفیٰ داخل کر دیا، اس میں لکھا کہ
''شہیدوں کے خون کی روشنائی میں قلم ڈبو کر میں حکومت برطانیہ
کی پبلسٹی کرنا نہیں چاہتا۔ کچھ دنوں کے بعد اس شبہ پر کہ میں
کانگریس کا کچھ کام کر رہا ہوں، گرفتار کر لیا گیا۔ ایک ماہ تک
سیکوریٹی قیدی میں رہا ——''

لیکن جمیل مظہری کی سیاسی سرگرمی زیادہ دنوں تک برقرار نہیں رہ سکی اور وہ اس سے دھیرے دھیرے دور ہو گئے۔ اس لئے کہ جمیل مظہری کے ذہن میں جو آزادی کا تصور تھا، یعنی دل، دماغ، روح کی آزادی، سرمایہ دارانہ نظام اور ذہنیت کا خاتمہ، غریب اور مزدور طبقہ کے ساتھ ہمدردانہ رویہ اور اور مکمل مساوات، لیکن خواب کی تعبیر جب دوسری شکل میں نظر آنے لگی تو انھوں نے اس سے الگ ہو جانا ہی مناسب سمجھا اور یہ کہنے پر مجبور ہوئے۔

ہوئے آزاد تو کیا، گردشِ دوراں ہے وہی
حسرت اے صبح وطن شام غریباں ہے وہی

اس کے بعد جمیل مظہری کلکتہ اور بمبئی تلاش معاش کے سلسلے میں گئے اور جوش ملیح آبادی کے کہنے پر ۴۳ء سے ۴۷ء تک فلمی دنیا سے وابستہ رہے، جہاں وہ گانے، مکالمے، گیت اور کہانیاں لکھتے رہے۔ لیکن ایک شاعر کی نازک مزاجی سے کون واقف نہیں، میر کی طرح جمیل نے بھی نازک مزاج پایا تھا۔ چنانچہ یہ احساس انہیں جس دن ہو گیا کہ ہیرو ہیروئنوں کے آگے انھیں کمتر سمجھا جاتا ہے اور بات چیت میں تصنع ہی تصنع ہے، اسی دن کئی لوگوں کے کہنے اور سمجھانے کے باوجود انھوں نے فلمی دنیا کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے چھوڑ دیا۔ اس سلسلے میں جمیل مظہری ایک جگہ لکھتے ہیں:

Scanned by CamScanner

''فلمی دنیا ترک صرف اس لئے کی کہ اس دنیا میں ادیبوں اور شاعروں کی کیا قدر ہوتی کتنی تذلیل ہوتی ہے ہیروئنوں اور ہیرو کے سامنے وہ لوگ حقیر سمجھے جاتے ہیں ، انھیں منشی کا لقب ملتا۔ غالباً آج بھی وہی حالت ہے اس لئے میں بھاگا۔''

جمیلؔ مظہری نے فلمی دنیا کی خودغرضی ، مفاد پرستی ، جھوٹ ، مکروفریب سے پُر زندگی اور پیسوں کے عوض فن کو بیچنے کے کرب کا اظہار اپنی دو نظموں ''بھاگ رے شاعر بھاگ'' اور ''تول اپنے کو تول'' میں بڑی خوبصورتی سے کیا ہے۔

فلمی دنیا ترک کرنے کے بعد جمیلؔ مظہری معاشی طور پر کچھ دن پریشان حال رہے لیکن تھوڑے ہی عرصہ بعد جنوری ۱۹۵۰ء میں بہار سرکار نے ان کی اعلیٰ صلاحیتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے پٹنہ یونیورسیٹی میں بحیثیت پروفیسر تقرری کردی۔ جہاں وہ انتقال سے چند سال قبل تک درس وتدریس کے فرائض بحسن وخوبی انجام دیتے رہے۔

یوں تو جمیلؔ مظہری اپنی نظموں اور غزلوں کی وجہ کر زیادہ مشہور ہوئے۔ لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ جمیلؔ مظہری نے اپنی نظموں اور غزلوں کے علاوہ جو دوسرے اصناف سخن مثلاً رباعی ، مثنوی ، قصیدہ ، ہجو ، مرثیہ ، گیت اور سلام وغیرہ پر جوطبع آزمائی کی ہے وہ یقیناً قابل قدر ہے اس لئے کہ ان تمام اصناف سخن میں جمیلؔ مظہری کا اپنا فلسفۂ حیات ، اپنے افکار واحساسات اور منفرد ومخصوص لب ولہجہ پوری جذباتیت کے ساتھ موجود ہے اس کے ساتھ ساتھ جمیلؔ مظہری کی پوری شاعری روایت میں ضم ہوتی نظر نہیں آتی بلکہ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے جمیلؔ مظہری نے اس سے خاطر خواہ روشنی حاصل کی ہے۔

آیئے جمیلؔ مظہری کی نظموں اور غزلوں سے قبل ان کی دوسری صنف شاعری کا جائزہ لیا جائے۔

مثنویاں یوں تو کئی دوسرے شعراء کی طرح جمیلؔ مظہری نے بھی کئی لکھیں ، لیکن خود انھوں نے صرف ایک مثنوی کو اشاعت کے لائق سمجھا جو ''آب وسراب'' کے نام سے منظر عام پر آئی۔ یہ مثنوی بلاشبہ ایک اچھے اور بڑے شاعر کی مثنوی لگتی ہے۔ اس میں اشعار کی روانی اور برجستگی کی وہ ساری خوبیاں موجود ہیں جو ایک کامیاب مثنوی کی خصوصیت ہوسکتی ہے۔

Scanned by CamScanner

میرے خیال سے جمیل مظہری کی اس مثنوی کو بھی وہی مقام دیا جا سکتا ہے جو حفیظ جالندھری اور علی سردار جعفری کی مثنویوں کو دیا گیا ہے۔

جمیل مظہری کے مرثیوں اور قصیدوں کا ایک مجموعہ ''عرفانِ جمیل'' کے نام سے منظر عام پر آ چکا ہے۔ ان مرثیوں اور قصیدوں کو پڑھنے کے بعد میر تقی میر کے مرثیوں اور قصیدوں کی یاد آتی ہے۔

جمیل مظہری کی ہجو بھی خاصی مشہور ہیں۔ خاص طور پر کلکتہ اور عظیم آباد کے لوگ جمیل مظہری کی ہجو نگاری سے بخوبی واقف ہیں۔ اس لئے کہ یہاں ان کے کئی دوستوں نے فرمائش کر کے اپنے دوستوں اور دشمنوں .... پر ہجو لکھوائیں۔ پٹنہ کے مشہور پرانے گھی فروش ''مولوی مکھن'' کے سلسلے میں جمیل مظہری کی ہجو کا بند ملاحظہ فرمائیں۔

اے مولوی مکھن ....

تم عقل کے دشمن ہو کہ ایمان کے دشمن

یا اپنی اٹھتی ہوئی دوکان کے دشمن

کیوں اپنے خریداروں کی ہو جان کے دشمن

اے مولوی مکھن اے مولوی مکھن ....

گھی بیچتے ہیں آپ کہ ہیں بیچتے ایمان

کھا کر اسے دبلے ہوئے پٹنے کے پہلوان

کمھلا گئے معشوقوں کے ابھرتے ہوئے جوبن

اے مولوی مکھن اے مولوی مکھن ....

پٹنہ کالج میں امتحان کے انچارج پروفیسر امبسٹ کی درگت بھی قابل مطالعہ ہے۔

یہ امبسٹ صاحب کی کدد یکھئے

تماشائے عقل و خرد دیکھئے

کہ شاعر کو کانسٹبل کر دیا

جو تھا ہاف میڈ اس کو فل کر دیا

جمیل مظہری کی ان ہجو کے چند اشعار دیکھنے کے بعد ہم یہ محسوس کرتے ہیں کہ جمیل

Scanned by CamScanner

مظہری کے اندر ہجو کہنے کی پوری صلاحیت تھی ۔ خاص طور پر دلچسپ اور تیکھا لب ولہجہ جمیؔل مظہری کو ممتاز بناتا ہے۔

جمیؔل مظہری کی رباعیوں میں بھی فکروفن کے نئے نئے گل وبوٹے کھلتے نظر آتے ہیں۔جن میں دلآویزی اور سحر آفرینی کے نمونے بدرجہ اتم موجود ہیں ۔جمیؔل مظہری کی رباعیوں کے سلسلے میں پروفیسر احتشام حسین رقم طراز ہیں:

''فکروفن میں ''صدائے شکست'' کے عنوان سے جو رباعیاں شامل ہیں وہ توازن کے درہم برہم نہ ہونے ، جذباتی بےچینی کے ساتھ ساتھ فکری ہیجان اور انسان اور قدرت کی باہمی آمیزش کا بہت اچھا آئینہ ہیں ۔ ذاتی تجربے اور انفرادی غم نے حقیقتِ غم ، مجبوری، انسانی قوت مشیت وغیرہ کے متعلق سوچنے پر مجبور کردیا ، پھر چونکہ اوروں نے بھی ان مسائل سے آنکھیں ملائی تھیں ، اس لئے انفرادی تجربے عمومی فلسفوں میں ڈھلنے کی کوشش کرنے لگے۔''

مندرجہ بالا باتوں کی تائید کے لئے ایک رباعی بطور نمونہ ملاحظہ فرمائیں۔ ؎

مضراب سے تیری حالت ساز سنی
شیشے سے صدائے سنگ انداز سنی
ٹوٹا جو اچانک میرا ساغر کل رات
میں نے اک قہقہے کی آواز سنی

جمیؔل مظہری کی نظمیں ، جنہیں وہ بذات خود غزلوں سے زیادہ بہتر مانتے ہیں، کا مطالعہ بھی ضروری ہے ۔جمیؔل مظہری کی نظمیں ''تفکرات وتاثرات'' سیاسیات وعمرانیات ، رومانیات وشبابیات وغیرہ جیسے عنوانات کے تحت ''نقش جمیل'' میں ملتی ہیں۔ان کے علاوہ بھی کئی دوسری اعلیٰ پایہ کی نظمیں مختلف ادبی رسالوں میں نظر سے گذرتی رہی ہیں۔

جمیؔل مظہری کی بیشتر نظمیں اس زمانے کی یاد دلاتی ہیں جب ہندوستان میں ہر جانب

Scanned by CamScanner

اتھل پتھل مچی ہوئی تھی ۔ سیاسی و سماجی حالات بڑی تیزی سے اپنا رخ بدل رہے تھے ۔ اضطراب اور جوش وخروش کی کیفیت لوگوں کے دلوں میں جگہ پا رہی تھی ۔ جمیؔل مظہری بھی ہوا کے اس رخ سے متاثر ہوئے اور قلم لے کر میدان جنگ میں اتر آئے اور انگریزوں کی غلامی کے خلاف آواز اٹھانے لگے ۔انہیں مار بھگانے کے لئے لوگوں کے دلوں میں احساسات و جذبات سے پُر لفظوں میں ہمت، حوصلہ اور جوش و ولولہ پیدا کرنے لگے ۔لیکن چونکہ جمیؔل مظہری نے مہاتما گاندھی کے عدم تشدد کے فلسفہ کو بھی قبول کیا تھا اس لئے ان کی انقلابی اور سیاسی نظموں میں گھن گرج یا سطحی نعروں یا عامیانہ رویے کی بجائے سنجیدگی، اعتدال ،ضبط وتحمل اور آزادی و انقلاب کے واضح تصور کے ساتھ ساتھ اعلیٰ خیال، گہرے فکر وفن کے نمونے ملتے ہیں ۔ اس ضمن میں ہم جمیل مظہری کی کئی مشہور نظمیں مثلاً ''نوائے جرس''، ''تغیرات''، ''بھارت ماتا''، ''دعوت عزم''، ''وقت کی دھارا پھیرنے والے''، ''جشن آزادی''، ''یوم آزادی''، ''دھارے''، ''موسم کے اشارے'' وغیرہ پیش کر سکتے ہیں۔

جمیؔل مظہری کی بقیہ دوسری نظمیں جو ''تفکرات وتاثرات'' کے تحت آتی ہیں، ان میں جمیل مظہری کے افکار و خیالات اور فن کے اعلیٰ نمونوں کے ساتھ ساتھ تشکیک کا پہلو نمایاں ہے ۔خواہ وہ فلسفہ کا معاملہ ہو یا مذاہب کا سوال ۔تشکیک بہر حال ہے ۔اور اس کی وجہ مختلف مذاہب اور فلسفۂ حیات کا گہرا مطالعہ ہے ۔اور ان مطالعوں کی روشنی میں جمیؔل مظہری کا ذہن منتشر نظر آتا ہے، جو تشکیک کا روپ اختیار کر لیتا ہے ۔ عام طور پر جمیؔل مظہری کی تشکیک کو مشیت کامل سے انکار تصور کیا جاتا ہے ۔حالانکہ ایسی بات نہیں ہے ۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ جمیؔل مظہری کا اس طرح کا اظہار خیال انکار اور اقرار کے درمیان کی کشمکش کے واضح ثبوت فراہم کرتا ہے اور خدا اور کائنات کے تخلیقی مقصود سے قریب کرتا ہے ۔ساتھ ہی ساتھ غور وفکر کے دروازے وا کرتا ہے ۔ بقول پروفیسر احتشام حسین :

> ''ان کی تشکیک خیال افروز بھی ہے اور تخلیقی بھی ۔ وہی ان کو خدا اور کائنات کے ایک تخلیقی مقصد تک پہنچاتی ہے ۔''

اس سلسلے میں جمیؔل مظہری کی دوسری کئی نظموں کے ساتھ ساتھ ''پیام''، ''آدم نو کا ترانہ''، ''سفر''، ''خانۂ آدم اور ارتقا'' کا ذکر کیا جا سکتا ہے۔

Scanned by CamScanner

جمیؔل مظہری کی ان نظموں کے علاوہ رومانیات اور شبابیات کے تحت جو نظمیں ہیں ان میں اہم اور خاص بات یہ ہے کہ عشق و محبت کے فسانے ،احساس محرومی، ناکامی اور بے بسی کی واضح اور صاف تصویریں دوسرے کئی نظم گو شعراء کی طرح جمیؔل مظہری بھی پیش کرتے ہیں لیکن جو بات انہیں ممتاز اور منفرد کرتی ہے وہ ہے خیالی اور تصوراتی دنیا سے گریز ۔جمیؔل مظہری ہمیشہ اختر شیرانی کی طرح سلمٰی اور عذرا کی طرح گھریلو اور ارضی لڑکیوں سے عشق کرتے ہیں اور پھر ناکامی عشق پر روتے ہیں ۔''یہ کیا ہوا تم کو''، ''کہانی دوشیزۂ بنگال''، ''اعتراف''۔''اس کو کیا محبت''، ''ڈرو خدا سے ڈرو'' وغیرہ جیسی معرکۃ الآرا نظموں میں جمیؔل مظہری کا فن عروج پر نظر آتا ہے۔

جمیؔل مظہری جوشؔ، فراقؔ، حفیظ جالندھری، فیضؔ، جذبؔی وغیرہ کے ہم عصر رہے ہیں اور انہوں نے اردو شاعری میں اپنے فکر واحساسات اور جذبات کو رنگارنگی، شوخی اور شگفتگی کے ساتھ پیش کیا ہے۔

جمیل مظہری نے اپنی بیشتر نظموں میں اپنے فلسفۂ حیات اور زندگی کے اسرار ورموز کو تمام تر شاعرانہ اور فن کارانہ لوازمات کے ساتھ پیش کرنے کی کوشش کی ہے اور اس کوشش میں انہیں خاطر خواہ کامیابی بھی ملی ہے ۔لیکن جہاں تک ان کی غزلوں کا تعلق ہے اس صنف میں انہیں وہ کامیابی یا وہ مقام حاصل نہ ہو سکا جو بحیثیت نظم نگار جمیل کو ملا ہے۔خاص طور پر ان غزلوں میں جن میں فلسفیانہ نکات اور حکیمانہ اشارات ہیں۔خود جمیؔل مظہری کو اس بات کا احساس تھا۔

تمہاری اس غزلیت کو کیا کہوں میں جمیؔل
جو فلسفہ نہ بنی اور شاعری نہ رہی

یا یہ شعر۔

ہے آب و رنگ سے خالی جمیؔل کی یہ غزل
ادب اس کو نہ سمجھئے کہ ہے یہ بے ادبی

میرے خیال میں اس کی وجہ یہ ہے کہ غزل بھاری بھرکم اور ثقیل الفاظ، بوجھل اور فلسفیانہ وصوفیانہ خیالات کی متحمل نہیں ہے۔اگر غزل میں ثقیل الفاظ مستعمل ہوتے ہیں تو ان میں رنگ تغزّل اور شعریت کی کمی کا احساس شدّت سے ہوتا ہے۔جمیؔل مظہری فرماتے ہیں:

Scanned by CamScanner

''غزل کا مزاج دھان پان ہے، جو نہ کسی ثقیل لفظ کا متحمل ہے، نہ ثقیل خیال کا۔''

جمیلؔ مظہری نے اپنے ہم عصر شعراء کے ساتھ ساتھ اپنے پیش رو شعراء کا بھی گہرا مطالعہ کیا، خاص طور پر وہ غالب اور اقبال سے کافی متاثر تھے۔ چنانچہ ان کی نظموں اور بعض غزلوں میں تشکیک اور خودی و بے خودی کے فلسفیانہ اور صوفیانہ اثرات نمایاں ہیں۔ ایسی غزلوں میں تفکرات تو ملتے ہیں، لیکن وہ شعلگی، نغمگی، برجستگی اور شوخی و شگفتگی نہیں جو غالبؔ، اقبالؔ اور اس قبیل کے دوسرے شعراء کا خاصہ ہے۔ جمیلؔ مظہری کے چند اشعار پیش ہیں۔

جمیلؔ کو گھر ہی مبارک کہ اب تو سامان بھی وہی ہے
جو دل کی وحشت کا ہے تقاضا خرد کا میلان بھی وہی ہے

☆

ہماری میزان آگہی میں یقین کیا ہے گماں کی شدت
جو شک کی آغوش میں پلا ہو اصولاً ایمان بھی وہی ہے

☆

جمیلؔ راز آگہی یہ اپنی نہ ڈال وارفتگی کے پردے
نگاہ کتنی ہی مشتعل ہو مگر یہ تیور ہیں مجرمانہ

ان اشعار کے علاوہ یہ اشعار بھی قابلِ غور ہیں۔

نہ فسوں رہا نہ کشش رہی نہ جنوں رہا نہ تپش رہی
فقط ایک زعم وفا رہا جو مری خودی کو غذا رہا

☆

ہے دل میں احساس درد اب تک اگرچہ دیوانہ ہوگیا ہوں
جہاں خودی ہے نہ بے خودی ہے اک ایسی دنیا میں کھوگیا ہوں

☆

میں ادھر ادھر جو بڑھا رہا ہوں ہوس کے دست دراز کو
مری زندگی کا یہ طنز ہے تری شان بندہ نواز پر

☆

Scanned by CamScanner

جمیلؔ مظہری اپنے ہم عصر غزل گو شعراء میں فراقؔ، جگر، اجتبیٰ رضوی اور پرویز شاہدی کے فکر و فن کی عظمت کے بھی قائل تھے۔ جمیلؔ مظہری اس بات کے بھی معترف تھے کہ فراقؔ نے نئے استعاروں، نئی ترکیبوں اور اشاریت و ایمائیت سے اردو غزل کو روشناس کرایا ہے۔ جگر نے غزل کو نیا اور منفرد لب و لہجہ دیا ہے۔ اجتبیٰ رضوی کی غزلوں میں تصوف اور رومان کی ایک خاص قسم کی آمیزش ہے اور پرویز شاہدی کی غزلوں میں سرور و مستی اور انفرادیت کی جھلک ہے۔ ایک مقطع ملاحظہ فرمایئے۔

جمیل حیرت میں ہے زمانہ تیرے تغزل کی مفلسی پر
نہ جذبہ 'اجتبائے رضوی' نہ کیف پرویز شاہدی کا

اس انکسار سے قطع نظر جمیلؔ کی عشقیہ غزلوں میں جذبے سے فکر تک اور مشاہدے سے وجدان تک کی پوری کہانی ملتی ہے ان کا کلام داخلیت اور خارجیت سے ہم آہنگ ہے۔ چند اشعار پیش خدمت ہیں۔

میں خود ہی جل رہا ہوں محبت کی آگ سے
دامن پہ ان کے آنچ جو آئے تو کیا کروں

☆

تمناؤں کے گھر میں نا امیدی آ نہیں سکتی
محبت نے مقدر کو بٹھا رکھا ہے پہرے پر

☆

کھڑی ہے مندر میں ایک حسینہ، سیاہ جوڑا کھلا ہوا ہے
نشیلی آنکھوں میں اک تمنا، کنوارے ہونٹوں پہ اک دعاء ہے

☆

شعلوں کا تماشا بھی دیکھا، آنچل سے ہوا بھی دیتے رہے
آنچ آنے لگی جب دامن تک گھبرا کے اسے ٹھنڈا بھی کیا

☆

Scanned by CamScanner

جمیلؔ مظہری کی غزلوں کا مطالعہ بتاتا ہے کہ شاعر نے جہاں زندگی اور کائنات کے اسرار و رموز کو اپنے مخصوص فکر و آہنگ کے ساتھ پیش کرنے کی کوشش کی ہے، وہاں شعروں میں ایک خاص قسم کی موسیقیت، نغمگی اور روانی ہے جیسے یہ اشعار ؎

بقدر پیمانۂ تخیل سرور ہر دل میں ہے خودی کا
اگر نہ ہو یہ فریب پیہم تو دم نکل جائے آدمی کا

☆

اس کو کیا حق ہے کہ قطرے سے سمندر مانگے
جس نے قطرے کو سکھایا نہیں دریا ہونا

☆

اس تجزیہ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ جمیلؔ مظہری کی جن غزلوں میں نفسیات حسن وعشق اور واردات قلبی کا بیان ہے ان سے شاعر کی شناخت ہوتی ہے۔ یہ تمام باتیں ایسی ہیں، جو جمیل مظہری کی شاعرانہ عظمت کے لئے کافی ہیں۔

Scanned by CamScanner

کیفی اعظمی

نام : سید اطہر حسین رضوی
تخلص : کیفؔی
ولادت : 1918ء (مجواں گاؤں، اعظم گڑھ، اتر پردیش)
وفات : ۱۰ر مئی ۲۰۰۲ء (بمبئی)
نام والد: سید فتح حسین رضوی
شعری تصنیفات:

(۱) جھنکار (پہلا مجموعہ کلام) ۱۹۴۳ء
(۲) آخر شب (دوسرا مجموعہ کلام) ۱۹۴۷ء
(۳) آوارہ سجدے (تیسرا مجموعہ کلام) ۱۹۷۳ء
(۴) میری آواز سنو (فلمی گیت) ۱۹۷۴ء
(۵) ابلیس کی مجلسِ شوریٰ ۱۹۷۷ء

rekhta

Scanned by CamScanner

کیفی اعظمی انقلابی شاعر

ترقی پسند تحریک اور اردو شاعری کا ایک بڑا اہم اور معتبر نام کیفی اعظمی کا ہے۔ جس نے نہ صرف ترقی پسند ادب بلکہ پوری اردو شاعری کو اپنے فکروفن سے مالا مال کیا ہے۔

کیفی اعظمی کی شاعری کی ابتدا دوسرے کئی اہم شعراء کی طرح رومانیت سے ہوئی۔ لیکن آہستہ آہستہ قومی اور بین الاقوامی سیاسی، سماجی اور اقتصادی مسائل، جبر وظلم، تشدد اور استحصال اور انسانی درد وکرب کے مطالعہ ومشاہدہ نے کیفی اعظمی کو متاثر کیا، جن کا خوبصورت اور مؤثر اظہار انہوں نے اپنی شاعری میں کیا۔

کیفی اعظمی کی شاعری کا جائزہ لینے سے قبل ان کی شخصیت کا مختصراً مطالعہ کیا جائے تو اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ کیفی بچپن سے ہی غیر معمولی دردمند دل اور حساس ذہن کے مالک تھے۔ انھوں نے اپنے گاؤں کی غریبی اور فاقہ کو دیکھا اور شدت سے محسوس کیا۔ ان کی دردمندی کا ثبوت اس سے بڑھ کر اور کیا ہوسکتا ہے کہ بچپن میں وہ عید کے نئے کپڑے پہننے سے اس لئے انکار کرتے کہ ان کے گاؤں کے غریب بچوں کو عید کے روز بھی نئے کپڑے میسئر نہیں تھے۔ ایسے دردمند اور حساس شاعر کا اپنے اردگرد کے ماحول سے متاثر ہونا بالکل فطری تھا۔

کیفی ایک جانب جہاں اپنے اردگرد کے جاگیردارانہ ماحول، جبرو استبداد، غربت و افلاس سے متاثر ہوئے، وہیں عہد شباب کے فطری تقاضوں سے وہ کیسے محروم رہ سکتے تھے۔

Scanned by CamScanner

انھوں نے بھی صنف نازک کے حسن و شباب اور اپنے لکھنؤ کے قیام کے دوران مبتلائے عشق ہر کئی مؤثر نظمیں اور غزلیں لکھیں۔ ان کے پہلے شعری مجموعہ ''جھنکار'' کی ''برسات کی ایک رات''، ''پیتل کے کنگن''، ''آندھی''، ''شام''، ''کہرے کا کھیت''، ''دوشیزہ مالن''، ''سویرے سویرے'' وغیرہ اور دوسرے شعری مجموعہ ''آخرِ شب کی تجدید''۔ ''تم''، ''نرسوں کی محافظ''، ''تصور''، ''دوراتیں''، ''ملاقات''، ''مجبوری''، ''نصیحت''، ''نقش و نگار'' وغیرہ جیسی خوبصورت نظموں میں حسن و عشق کے احساسات و جذبات پوری طرح بیدار نظر آتے ہیں۔ ان نظموں کے مطالعہ کے دوران بے اختیار اختر شیرانی اور فراق جیسے شعراء کے عشق کی داستان سامنے آجاتی ہے۔ لیکن کیفی کے عشق اور رومان میں بھی ایک اعلیٰ معیار و وقار کے ساتھ ساتھ تقدس اور پاکیزگی کا احساس ملتا ہے۔ چند نظموں کے بند دیکھئے:

شگفتگی کا ، لطافت کا شاہکار ہو تم
فقط بہار نہیں حاصل بہار ہو تم
جو ایک پھول میں ہے قید وہ گلستاں ہو
جو اک کلی میں ہے پنہاں وہ لالہ زار ہو تم
(''تم'')

یہ کس طرح یاد آرہی ہو ، یہ خواب کیسا دکھا رہی ہو
کہ جیسے سچ مچ نگاہ کے سامنے کھڑی مسکرا رہی ہو
یہ جسم نازک ، یہ نرم باہیں، حسین گردن ، سڈول بازو
شگفتہ چہرہ ، سلونی رنگت ، گھنیرا جوڑا، سیاہ گیسو
نشیلی آنکھیں ، رسیلی چتون ، دراز پلکیں ، مہین ابرو
تمام شوخی ، تمام بجلی ، تمام مستی ، تمام جادو
ہزاروں جادو جگا رہی ہو ، یہ خواب کیسا دکھا رہی ہو
(ملاقات)

وہ گاتی گنگناتی نوجوانی کی خموشیاں
خموشیوں میں وقت کی پکار لے کے آئی تھی

Scanned by CamScanner

بسنتی ساری میں چھپا ہوا سادہ جواں بدن
جواں بدن یہ ریشمی بہار لے کے آئی تھی
وہ اجاڑ زندگی کی چلچلاتی دھوپ میں
وہ گیسوؤں کا ابرِ عطر بار لے کے آئی تھی
(ملاقات)

اس کی آنکھوں سے برستی ہے شراب
پی کے بے خود ہو نہ جاتا کس طرح
اس کے ہونٹوں پر جب آتی ہے ہنسی
پھیل جاتی ہے فضا میں چاندنی
(مجبوری)

یہ جوان جسم یہ لطیف بدن
جیسے سانچے میں ڈھل گئی ہے پھوار
خون دوڑا دیا ہے فطرت نے
گوندھ کر کچے موتیوں کا ہار
(نقش ونگار)

حسن وعشق اور فطرت کی رنگینیوں سے معمور کیفی کی کئی نظمیں ان کے دونوں ابتدائی شعری مجموعوں ''جھنکار'' اور'' آخرشب'' میں ملتی ہیں جو برسوں بعد آج بھی اسی طرح تازگی اور شگفتگی لئے ہوئے ہیں۔ کیفی کو جب ناکامیٔ عشق کا سامنا پڑا تو اس ناکامیٔ عشق کو بھی انہوں نے اسی جذباتیت کے ساتھ گلے لگایا، جس جذباتیت سے عشق کی شعلگی کو سینے سے لگایا تھا۔ ''اندیشے''، ''پشیمانی'' اور ''احتیاط'' وغیرہ اس کی خوبصورت مثال ہیں۔

میں یہ سوچ کر اس کے در سے اٹھا تھا
کہ وہ روک لے گی منا لے گی مجھ کو
ہواؤں میں لہراتا آتا تھا دامن
کہ دامن پکڑ کر بٹھا لے گی مجھ کو

Scanned by CamScanner

قدم ایسے انداز سے اٹھ رہے تھے
کہ آواز دے کر بلا لے گی مجھ کو
مگر اس نے روکا ، نہ مجھ کو منایا
نہ دامن ہی پکڑا ، نہ مجھ کو بٹھایا
نہ آواز ہی دی ، نہ مجھ کو بلایا
میں آہستہ آہستہ بڑھتا ہی آیا
یہاں تک کہ اس سے جدا ہوگیا میں
(پشیمانی)

پیار کا جشن نئی طرح منانا ہوگا
غم کسی دل میں سہی غم کو مٹانا ہوگا
(پیار کا جشن)

وہ مجھے بھول گئی اس کی شکایت کیا
رنج تو یہ ہے کہ رو رو کے بھلایا ہوگا
(پیار کا جشن)

دل نے ایسے بھی کچھ افسانے سنائے ہوں گے
اشک آنکھوں نے پئے اور نہ بہائے ہوں گے
بند کمرے میں جو خط میرے جلائے ہوں گے
ایک اک حرف جبیں پر اُبھر آیا ہوگا
(اندیشے)

اب تم آغوش تصور میں بھی آیا نہ کرو
میں اس اجڑے ہوئے پہلو میں بٹھالوں نہ کہیں
لب شیریں کا نمک عارضِ نمکیں کی مٹھاس
اپنے ترسے ہوئے ہونٹوں میں چرالوں نہ کہیں
(احتیاط)

Scanned by CamScanner

درد و کرب کی لذتوں سے آشنا ہونے کے بعد کیفی کی شاعری میں بتدریج فکر وفن کی بالیدگی، بھرپور اعتبار اور اعتماد کے ساتھ نظر آنے لگی اور آہستہ آہستہ وہ اپنے عہد کے اٹھتے ہوئے طوفان میں، نہ صرف فکری طور پر بلکہ عملی طور پر بھی شامل ہو گئے۔ ملک کی غلامی، ملک کا بٹوارہ، فرقہ وارانہ فسادات، اس عہد کے اہم حادثات و سانحات تھے، جنہیں کیفی نے بے حد قریب سے دیکھا اور شدت سے محسوس کیا۔ بے رحم اور سفاک زندگی کی حقیقتوں نے کیفی کی زندگی اور شاعری میں ایک انقلاب پیدا کر دیا۔ ''جھنکار'' اور ''آخر شب'' کے بعد اپنے تیسرے مجموعہ ''آوارہ سجدے'' میں کیفی نے اپنی شاعری کے بدلتے ہوئے تیور کا اعتراف ان لفظوں میں کیا ہے:

> ''جھنکار' سے 'آوارہ سجدے' تک میری شاعری نے جو فاصلہ طے کیا ہے، اس میں وہ مسلسل بدلتی اور نئی ہوتی رہی ہے۔ آج وہ جس موڑ پر ہے اس کا نیا پن بڑا واضح ہے۔ یہ رومانیت سے حقیقت پسندی کی طرف کوچ کا موڑ ہے۔''

کیفی اعظمی کی رومانیت سے حقیقت پسندی کی طرف کوچ کرنے کی چاپ ۱۹۴۵ء کے آس پاس بلکہ ان کے دوسرے شعری مجموعہ ''آخر شب'' میں بڑے واضح طور پر سنائی دینے لگی تھی۔ انقلاب، بغاوت اور دشمنوں سے ٹکر لینے کی گھن گرج ''فیصلہ'' ''تلاش''، ''''کب تک''، ''آخری مرحلہ''، ''مژدہ''، ''تربیت'' وغیرہ میں بڑے ہی واضح انداز میں موجود ہے۔ حب الوطنی کا جذبہ، اور انگریزوں اور ان کے ہمنواؤں، سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کے ظلم و استبداد نے کیفی کے دل و دماغ میں ان کے خلاف نفرت کی چنگاریاں بھر دیں۔ اس دور کی کیفی کی کئی نظموں میں شعلہ سا لپکتا ہوا نظر آتا ہے۔ ''فیصلہ''، ''تلاش''، ''کب تک''''آخری مرحلہ''، ''آزادی''، ''حملہ'' وغیرہ میں انگریزوں کو ملک بدر کرنے اور جنگ آزادی میں مجاہدین کو حوصلہ دینے کا انداز بڑا ہی مؤثر ہے۔ فرقہ وارانہ فسادات اور تقسیم ملک کے فیصلہ سے بھی وہ دل برداشتہ اور افسردہ نظر آتے ہیں جس کا اظہار اپنی نظموں میں بے حد جذباتیت کے ساتھ کرتے ہیں۔

Scanned by CamScanner

جانے کس کوکھ نے جنا اس کو
جانے کس صحن میں جوان ہوئی
جانے کس دیس میں پلی کمبخت
ویسے یہ ہر زبان بولتی ہے
زخم کھڑکی کی طرح کھولتی ہے
(بہروپنی)

یہ راجہ یہ انگریز کے میزباں
ہیں بھارت میں انگلینڈ کے پاسباں
جہاں پائی ہے رہزنوں نے اماں
وہ دیوار و در کو گراتے چلو
بغاوت کا پرچم اڑاتے چلو
(حملہ)

غلامی کا سفینہ گھومتا ہے ڈگمگاتا ہے
جواں موجیں لئے دامن میں ساحل مسکراتا ہے
جواں موجوں پہ بل کھاتی ــــ چلی آتی ہے آزادی
اٹھے ہیں طوفاں جھوم کر زخمی جیالوں سے
ہوا کاندھا ملا کر چل رہی ہے انقلابوں سے
جمود خامشی کی تہہ میں ہنگامے مچلتے ہیں
ہلا کر کوہساروں کی جڑیں چشمے ابلتے ہیں
چٹانیں توڑتی ڈھاتی ــــ چلی آتی ہے آزادی
(آزادی)

نئے ہندوستاں میں ہم نئی جنت بسائیں گے
تڑپ دے کر خس و خاشاک کو بجلی بنائیں گے

Scanned by CamScanner

کوئی آواز دیدے آتشِ افشاں چاند تاروں کو
کہ اب خاک وطن کے جھلسے ذرّے جگمگائیں گے
اداسی مسکرائے گی ، بیاباں لہلہائیں گے
نئے ہندوستاں میں ہم نئی جنت بسائیں گے
(نئی جنت)

کیفی اعظمی بنیادی طور پر امن پسند شاعر ہیں۔اس لئے ان کی شاعری میں جا بجا امن کا پیغام ضرور ملتا ہے لیکن وہ کبھی ظالموں، جابروں سے سمجھوتہ کرنے پر رضامند نظر نہیں آتے اور یہی وجہ ہے کہ اشتراکیت کے نظریہ حیات کو ماننے والا، امن عالم کا یہ شاعر جنگ کا مخالف بن کر انگریزوں اور ایسے دوسرے تمام ظالموں کے خلاف آواز اٹھاتا ہے۔کیفی اعظمی کی شاعری پر یہ الزام ہے کہ ان کی بیشتر شعری تخلیقات وقتی ہنگاموں کا نتیجہ ہیں۔لیکن میرے خیال میں درحقیقت شاعری وہی ہے جس میں فکر واحساس کی تمام تر کیفیات کے ساتھ ساتھ اس عہد کی روداد بھی ملے۔اپنے عہد اور دور کے سانحات، واقعات، حادثات اور انقلابات سے متاثر ہو کر تخلیقی ادب پیش کرنا ہر فنکار کا فطری عمل ہے۔جو بظاہر وقتی ضرور معلوم ہوتا ہے لیکن اسے دائمی حیثیت مل جاتی ہے اسی احساس کے تحت کیفی نے اپنے دوسرے شعری مجموعہ ''آخرِ شب'' کے پیش لفظ میں ایلنیا اہرنبرگ کا یہ قول دہرایا ہے:

''ایک ادیب کے لئے یہ ضروری نہیں کہ وہ ایسے ادب کی تخلیق کرے جو مستقبل کی صدیوں کے لئے ہو۔اسے ایسے ادب کی تخلیق پر بھی قدرت ہونی چاہئے جو صرف ایک لمحے کے لئے ہو۔اگر اس ایک لمحے میں اس کی قوم کی قسمت کا فیصلہ ہونے والا ہے۔''

اس لئے کیفی اعظمی کی شاعری کو وقتی اور ہنگامی کہہ کر اس کی اہمیت اور افادیت کو کم نہیں کیا جا سکتا۔جس طرح عالمی جنگ، انگریزوں کی غلامی، جنگ آزادی، ملک کا بٹوارہ، فرقہ وارانہ فسادات، خانہ جنگی اور اس نوع کے دوسرے واقعات آج بھی ہمارے دل و دماغ پر چھائے ہوئے ہیں، ٹھیک اسی طرح اس عہد کی شاعری اور دوسرے تمام تخلیقی ادب کو ہم فراموش نہیں کر سکتے۔کیفی کے پیش رو شعراء جیسے حسرت موہانی، فراقؔ، جوشؔ، ن۔م۔راشدؔ،

Scanned by CamScanner

فیض، ساغر نظامی، شمیم کریانی اور سلام مچھلی شہری وغیرہ اور پھر ان کے کئی ہم عصر شعراء مثلاً مجاز، مخدوم، جذبی، احمد ندیم قاسمی، ظہیر کاشمیری، ساحر، پرویز شاہدی، مجروح، وامق جونپوری تاباں، نیاز حیدر، جاں نثار اختر وغیرہ نے بھی ان موضوعات پر اپنی اعلیٰ اور گراں قدر شعری تخلیقات پیش کر کے آج اردو شاعری کے اہم ستون بن گئے ہیں۔ کیفی اعظمی نے بھی اپنے موضوعات اور فنی تقاضوں کو بڑی خوش اسلوبی سے پورا کرتے ہوئے بلا شبہ اپنی شاعری کو لافانی بنادیا ہے۔

اہم بات یہ بھی ہے کہ ترقی پسند تحریک اور اشتراکیت کے نظریۂ حیات سے پوری طرح وابستہ ہوتے ہوئے بھی ان کے حصار میں کبھی بھی پوری طرح مقید نہیں رہے بلکہ ہمیشہ فکر وفن کو اہمیت دی۔ ان کے طنزیہ احتجاجی لہجہ میں بھی جذباتیت، فنی مہارت اور فکری بالیدگی کا عنصر کارفرما نظر آتا ہے۔ کیفی جس خوبصورتی اور فنکارانہ التزام کے ساتھ زندگی کی بنیادی حقیقتوں کو پیش کرتے ہیں، وہ پورے طور پر داخلی اور شخصی تجربات واحساسات میں ڈوبی نظر آتی ہیں۔ مزدوروں، کسانوں اور غریبوں کی زندگی اور ان کی تحریکوں میں براہ راست شامل ہو کر کیفی اعظمی نے زندگی کی ان بنیادی حقیقتوں کو بے حد قریب سے دیکھا اور شدت کے ساتھ محسوس کیا اور ان ہی محسوسات وجذبات کے پرخلوص اظہار نے انہیں ترقی پسند شعراء کی صف میں بھی ممتاز درجہ عطا کیا۔ ویسے بھی کیفی نے ترقی پسند مصنفین کے پہلے منشور یعنی زندگی کے بنیادی مسائل بھوک ، افلاس ، سماجی پستی اور غلامی کے خلاف بڑی شدت سے آواز اٹھائی، جن میں فکری اور فنی اعتماد اور اعتبار پورے طور پر نظر آتا ہے۔ کیفی کی عظمت کا اعتراف فیض احمد فیض نے ان لفظوں میں کیا ہے:

> ''بنیادی طور پر کیفی کا مزاج لڑکپن سے عاشقانہ ہے۔ لیکن غنائیہ شاعر کی سطحی تکلفات اور مصنوعی زیبائشوں سے کیفی نے بہت کم سروکار رکھا ہے۔ غم جاناں کا ذکر ہو یا غم دوراں کا، بوسۂ لب کی بات ہو یا بوسۂ زنجیر کی، کیفی بات ہمیشہ کھری کہتے ہیں۔ جیسی سفاک اور بے رحم زندگی ہمارے گردو پیش موجود ہے اس کی بے کم وکاست منظر کشی کیفی کا مسلک شعر ہے۔ نہ تلخی مضمون سے گھبراتے

Scanned by CamScanner

ہیں، نہ تلخیٔ کلام سے گریز کرتے ہیں۔ نہ زہر کو قند بنا کر پیش کرنے
کے قائل ہیں نہ قند کی حقیقت سے انکار ہی۔ اس کے باوجود کیفی
کی شاعری زہر اور قند کا ملغوبہ نہیں ہے۔ بلکہ ایک متوازن
ٹھہرے ہوئے دردمند، فکر انگیز اور حساس نظریۂ حیات وفن کا بلیغ
اظہار ہے، جس میں کوئی جھول اور کوئی تضاد مشکل ہی سے دکھائی
دے گا۔"

کیفی اعظمی زندگی کے مختلف بنیادی مسائل کو پیش کرنے کے ساتھ قومی اور بین الاقوامی حادثات اور واقعات پر بھی گہری نظر رکھتے ہیں اور مختلف عنوانات کے تحت اپنے احساسات وجذبات کا اظہار کرتے ہیں۔ خاص طور پر جنگ اور اس کے بعد کی تباہی وبربادی کو کیفی نے بڑی شدت سے محسوس کیا اور اس احساس نے ان کے دل میں جنگ سے نفرت کا جذبہ پیدا کر دیا۔ جنگ خواہ عالمی ہو یا خانگی، بہر حال جنگ ہے۔ جس میں لاکھوں کروڑوں انسانوں کی جانیں تلف ہوتی ہیں۔ کروڑوں انسان اقتصادی بحران کا شکار ہوتے ہیں۔ گرانی، بیروزگاری، قحط اور ہلاکت کا خوفناک منظر ہر سمت منڈلاتا نظر آتا ہے۔ ایسے سفاک اور بے رحم حالات سے کون متاثر نہیں ہوگا اور پھر کیفی تو ایک حساس اور دردمند شاعر ہیں۔ انھوں نے اپنی نظموں میں امن اور جمہوریت کا پیغام دیا، اور ایسے افراد کی نشان دہی کی جو اپنے مفاد کے لیۓ جنگ کی فضا تیار کرتے ہیں، اور لاکھوں لوگوں کو اس آگ مین جھونک دیتے ہیں۔ اپنے ایک مضمون میں کیفی نے جنگ اور اس کے ردعمل کا اظہار اس طرح کیا ہے:

"پچھلی جنگ کی بات ہے۔ جیسے جیسے جنگ خطرناک صورت
اختیار کرتی جاتی تھی، سرمایہ دار کمپنیوں کے حصے بڑھتے جاتے
تھے۔ چیزوں کی قیمتیں دوگنی تگنی ہوکر بڑھ رہی تھیں۔ اور ساتھ ہی
مل مالکوں کے بینک بیلنس۔ لیکن جنگ کے ختم ہونے کے بعد
اگرچہ پھر پہلے جیسے حالات پیدا نہیں ہوئے کیونکہ جنگ کا ردعمل
بھی تو کم خطرناک نہیں ہوتا لیکن چیزیں آہستہ آہستہ سستی ہونے
لگیں اور سرمایہ داروں کا منافع گھٹنے لگا۔ اس طرح صاف ظاہر

ہو جاتا ہے کہ جنگ کی خواہش کون کر سکتا ہے اور کس فرض سے
کر سکتا ہے؟ ایک آدمی جس کو اپنی زندگی خود برقرار رکھنی پڑتی ہو،
اس پر بہت سی ذمہ داریاں ہوں، اس کی بہت سی خواہشیں ہوں
، امن کی مخالفت کیسے کر سکتا ہے؟ جبکہ وہ جانتا ہے کہ اس کی تمام
تمناؤں کی تکمیل اسی میں مضمر ہے۔''

کیفی اعظمی نے بھی ہر امن پسند کی طرح جنگ سے نفرت اور انسان کی زندگی، اس کے مستقبل اور اس کے ارتقاء سے محبت کی۔ یہی وہ تصورات ہیں جنہیں حقیقت میں بدلنے کی بھرپور کوشش کیفی نے اپنی شاعری میں کی ہے۔ اس سلسلے میں کیفی اعظمی کی نظم ''امن کا پرچم'' بہترین مثال ہے، جس میں امن کی خواہش اور جنگ سے نفرت کا اظہار بڑے ہی مؤثر انداز میں ملتا ہے۔ اور بے اختیار سردار جعفری کی نظم ''خونین ہاتھ'' احمد ندیم قاسمی کی نظم ''آخری فیصلہ'' ساحر کی نظم ''پرچھائیاں'' اختر الایمان کی نظم ''جنگ'' مخدوم کی نظم ''اندھیرا'' نیاز حیدر کی نظم ''امن کی راہ پر'' اور سلام مچھلی شہری کی نظم ''تیسری جنگ نہیں ہو سکتی'' وغیرہ یاد آتی ہے۔ جن میں جنگ کی تباہی و بربادی اور اس کی ہولناک اور خوفناک نتیجہ خیزی دکھا کر امن عالم کی ضرورت کو واضح کیا گیا ہے۔

''امن کا پرچم'' کے علاوہ کیفی اعظمی نے ایسی کئی نظمیں لکھی ہیں جن کے مطالعہ سے امن عالم کا تصور بڑے ہی واضح انداز میں سامنے آتا ہے اور محسوس ہوتا ہے کہ کیفی کس قدر جنگ سے نفرت اور اور دوستی کو پسند کرتے ہیں۔ ساری دنیا پر جنگ کے خطرناک بادل منڈلا رہے ہیں۔ ترقی پذیر ممالک جس طرح جنگ سازی میں منہمک ہیں ان کا یہ انہماک، حیات و کائنات کے لئے کس قدر مضر ہے۔ اس کا اندازہ کسے نہیں ہے۔ بڑھتی ہوئی بے چینی اور بے کیفی اور انتشار نے پوری دنیا کے امن پسند لوگوں کے سامنے ایک سوالیہ نشان کھڑا کر دیا ہے۔ کیفی ایسے سفاک اور بے رحم حالات کو روکنا چاہتے ہیں اور لوگوں کو امن، دوستی، محبت، بھائی چارگی، اخوت کا پیغام دیتے ہیں۔ عادت، ماسکو، بہرہ، آخری مرحلہ، پیار کا جشن اور عوام وغیرہ اس موضوع پر کیفی کی بہترین نظمیں ہیں جن میں ان کا گہرا مطالعہ و مشاہدہ اور حیات و کائنات کی تمام تر حقیقتیں بڑی خوبصورتی اور فنکارانہ التزام کے ساتھ سموئی گئی ہیں، جن کے

Scanned by CamScanner

مطالعہ کے بعد جنگ و جدل سے نفرت کی لہر اور امن و دوستی کی خواہش کو محسوس کیا جا سکتا ہے اور میرے خیال میں شاعری کی سب سے بڑی خوبی ہے کہ وہ قاری کو اس درجہ متاثر کرے کہ وہ اس کا ہمنوا بن جائے۔ کیفی کی نظموں کے چند بند ملاحظہ فرمائیں۔

پرچم امن بلند ، بلند اور بلند
تیرے سائے سے نکل کر اور کہاں جاؤں گا
ماسکو ساز اٹھا ساز اٹھا ساز اٹھا
آج ہر گیت اسی ساز پہ میں گاؤں گا
(ماسکو)

جب آنکھ ملی موت کا نذرانہ لئے
جب ہے ہونٹ زہر کا پیمانہ لئے
خون بہتا ہے تو بن جاتی ہے تصویر تری
جنگ اس ہاتھ میں اس ہاتھ میں ویرانہ لئے
تجھ سا دیکھا نہ سنا خون بہانے والے
(پہرہ)

پھر ایک بار بڑھو لے کے صلح کا پیغام
پھر ایک بار جلادو شکوک کے خرمن
(آخری مرحلہ)

کیفی اعظمی کی شاعری رومان سے انقلاب اور انقلاب سے امن عالم تک پھیلی ہوئی ہے، اپنے احساسات و جذبات کے منفرد اظہار و بیان ، اسلوب کی سادگی ، ندرت اور علامتوں، استعاروں و تشبیہوں کے خوبصورت اور برمحل استعمال سے اپنی شاعری کو ایک خاص مرتبہ اور اعلیٰ مقام عطا کرانے میں بے حد کامیاب ہیں۔

Scanned by CamScanner

سریر کابری

نام : سید محمد عباس

تخلص : سریرؔ

ولادت : ۱۸۸۸ء

وفات : ۲۰/ مارچ ۱۹۶۳ء

نام والد : سید شاہ رستم علی

مشغلہ : درس و تدریس

شعری تصنیفات :

(۱) نظر دلفگار (دیوان اوّل) ۱۹۰۷ء

(۲) صبح انقلاب (نظمیں) ۱۹۴۴ء

(۳) پرواز نظر (رباعیاں) ۱۹۴۷ء

(۴) مشاہدۂ حاضرہ (نظمیں) ۱۹۴۹ء

(۵) خاصان خدا (دینی نظمیں) ۱۹۵۱ء

(۶) شاہنامہ ہند (منظوم تاریخ ہند) ۱۹۵۴ء

(۷) خیابان سخن (دیوان دوئم) ۱۹۶۰ء

(۸) مسدس عالی (مجموعہ کلام) ۱۹۷۷ء

(۹) محشر انقلاب (نظموں کا مجموعہ) ۱۹۸۱ء

(۱۰) دوآتشہ (نظموں کا مجموعہ) ۱۹۸۵ء

Scanned by CamScanner

سرؔیر کابری: محشر انقلاب کا شاعر

صوبہ بہار میں شادؔ عظیم آبادی اور جمیلؔ مظہری کے بعد اردو شاعری کی آبرو اگر کوئی ہے تو وہ علامہ سرؔیر کابری ہیں جن کی شاعری میں سماجی، سیاسی، معاشرتی اور اصلاحی افکار کے ساتھ ساتھ حسن و عشق کی جو چنگاریاں ہیں وہ سرؔیر کابری کو منفرد اور معتبر بناتی ہیں، خود سرؔیر فرماتے ہیں ۔

تیرے سخن میں ہے سرؔیر جذبۂ دل کی تڑپ
تیری نوائے شوق نے کس کا نہ دل ہلا دیا

سرؔیر اپنی غزلیں تمہیں سناؤں کیا، پکڑ لوگے ہاتھوں سے اپنا کلیجہ
ہر ایک شعر ہے میرا اک تیر ونشتر، نہ میں کہہ سکوں گا نہ تم سن سکوگے

کلیجہ تھام لینے اور دل ہلا دینے والے تیر ونشتر اور احساسات وجذبات سے معمور سرؔیر کابری کی شاعری جس مقام اور عظمت کی متقاضی تھی، افسوس کہ اسے وہ جائز مقام نہ مل سکا ۔

پچپن برس کے بعد بھی پایا نہ کچھ سرؔیر
بدقسمتی رہی یہ مری شاعری کے ساتھ

سرؔیر کابری کے ساتھ اردو ناقدوں کی ناقدری اور بے توجہی کا احساس اردو کے مشہور ناقد ڈاکٹر عبد المغنی کو بھی تھا، جسے انہوں نے ''ادبی ظلم'' کا نام دیا ہے۔

Scanned by CamScanner

سرؔیر کابری کے ایک مجموعہ کلام ''محشر انقلاب'' میں ''پیش کتاب'' کے تحت ڈاکٹر عبدالمغنی لکھتے ہیں:

''شاہنامہ ہند کے مصنف جناب سرؔیر کابری کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں۔ لہٰذا ان کی ہر کتاب کسی کی تقریظ یا تعارف کے بغیر ہی شائع ہونی چاہئے۔ گرچہ یہ حقیقت اپنی جگہ ہے کہ سرؔیر کابری کی شاعری پر ہماری ادبی تنقید نے اب تک کوئی توجہ نہیں دی اور کوئی ایک تنقیدی مضمون بھی ایسا شائع نہیں ہوا، جس کی نشاندہی کی جا سکے۔

بہرحال، یہ بڑی عجیب صورت حال ہے اور بروقت اس ادبی ظلم کی تلافی کرنے کا موقع نہیں ملتا، جو سریر کابری پر روا رکھا گیا ہے۔۔ صرف چند خیالات اس لئے پیش کر رہا ہوں کہ شاید کسی مستعد اور باذوق طالب ادب کے دل میں سریر پر باضابطہ تحقیق و تنقید کا شوق جاگ اٹھے۔ خاص کر بہار کی یونیورسیٹی کے شعبہ ہائے اردو میں سرؔیر کی حیات اور شاعری پر کسی معتوبہ اور قابلِ ذکر کام کی تحریک پیدا ہو۔''

لیکن افسوس کہ تادم تحریر بہار یا دوسری کسی یونیورسیٹی کے شعبۂ اردو کی جانب سے ایسا کوئی کام نہیں ہوا، جس سے سرؔیر کابری کی شخصیت اور فن کو تحقیق و تنقید کی روشنی میں سامنے لایا جا سکے۔ ویسے وقتاً فوقتاً مختلف موضوعات کے تحت چند مضامین اور تبصرے ضرور شائع ہوئے لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان مضامین اور تبصرے سے سرؔیر کابری کی شاعرانہ عظمت کا پوری طرح احاطہ نہیں کیا جا سکتا ہے۔

علامہ سرؔیر کابری کے اب تک مختلف اصناف شاعری کے جو مجموعے منظر عام پر آئے ہیں ان میں ''نظم دلفگار'' (پہلا دیوان) ''صبح انقلاب'' (نظموں کا مجموعہ) ''پرواز نظر'' (رباعیات کا مجموعہ) ''مشاہدہ حاضرہ'' ''خاصان خدا'' ''خیابان سخن'' ''شاہنامہ ہند'' ''مسدس عالی'' ''دو آتشہ'' ''محشر انقلاب'' وغیرہ نے بلاشبہ قارئین کو متوجہ کیا اور اس دور کے

Scanned by CamScanner

''نکتہ رس'' نے سرؔیر کی پذیرائی بھی کی۔خود سرؔیر فرماتے ہیں۔

سریرا حباب نکتہ رس کہہ رہے ہیں سن کر کلام میرا
کہ بعد شاؔد و شفقؔ، وطن میں فقط میرے دم کی روشنی ہے

لیکن افسوس کہ ''نکتہ رسوں'' کی تعداد حلقۂ احباب سے باہر نہیں نکلی۔ حالانکہ سرؔیر کابری کی شاعری میں بقول ڈاکٹر عبدالمغنی:

''افکار کا ہجوم اور تصورات کا وفور ہے۔ان کے کلام سے غور و فکر کے دروازے کھلتے ہیں اور محسوس ہوتا ہے کہ فن زندگی کو آئینہ دکھا رہا ہے۔ یہ ایک ثروت مند فن ہے اور برائے فن نہیں ہے۔یہی اس کی عظمت کی دلیل ہے شاعر ہیئت کی کاریگری نہیں کرنا چاہتا بلکہ اپنے سوچے سمجھے خیالات اور محسوس کئے ہوئے جذبات میں دوسروں کو شریک کرنا چاہتا ہے۔اس کا مقصد بلند اور مطمح نظر اعلیٰ ہے۔یہ ایک سنجیدہ شاعری ہے۔تنقید حیات ہے۔اس کی قدر شناسی فن اور زندگی دونوں کی قدر دانی ہوگی۔''

(محشر انقلاب،صفحہ۱۲۔۱۱)

لیکن فن اور زندگی دونوں کی قدر دانی بھی عصبیت کا شکار ہے۔شاعر کے فکر فن کو بھی صوبائی اور شہری حدوں میں باندھا جاتا ہے۔اگر کوئی شاعر دلّی اسکول یا لکھنؤ اسکول سے تعلق رکھتا ہے تو اس کا فکر و فن اعلیٰ درجہ کا قرار پاتا ہے۔لیکن ایسے ہی اعلیٰ درجہ کی شاعری اگر بہار کے کسی شاعر کی ہے تو وہ کسی بھی حال میں قابلِ اعتنا نہیں ہے۔ حالانکہ طرز سخن اور فکر و احساس کی جو انفردیت بہار کے شعراء میں ہے وہ دوسروں میں کہاں؟ خود سرؔیر کابری کہتے ہیں۔

لکھنوی ہوں میں، نہ ہوں دہلوی لیکن سرؔیر
ہے مرا طرز سخن، مری زباں سب سے الگ

اس عصبیت کے شکار آج پورے صوبہ بہار کے شعراء ہیں۔ حد تو یہ ہے کہ شاؔد اور جمیؔل مظہری تک کا نام بڑی مشکلوں سے دبی زبان میں لیا جاتا ہے۔جس کے ہزاروں ثبوت

Scanned by CamScanner

موجود ہیں۔ سرؔیر بھی اس عصبیت کا شکار رہے۔ اور یہ عصبیت زبان و ادب دونوں کو نقصان پہنچا رہا ہے۔ جس کے لئے ایسے لوگوں کو ادبی اور لسانی تاریخ کبھی معاف نہیں کرے گی۔

اب جہاں تک سرؔیر کی شاعرانہ عظمت کا سوال ہے تو سرؔیر کی شاعری کا جادو سر چڑھ کر بولے گا، اس کا مجھے یقین ہے۔ انگریزی کے مشہور نقاد T.S. Eliot کا قول ہے:

A great Poet in writing of himsef writes of his age.

یعنی "ایک عظیم شاعر اپنے فن پارہ میں اپنے عہد کی تصویر کشی کرتا ہے۔"

سرؔیر کابری ایلیٹ کے اس قول پر نہ صرف پورے اترتے ہیں بلکہ دو چار قدم آگے بڑھ کر اپنے دور کے عہد سے اگلے کئی دور کے حالات و حادثات پر نظر رکھتے ہیں۔ غالباً اسی لئے یہ کہا گیا ہے کہ ہر بڑا شاعر اپنے وقت سے بہت پہلے پیدا ہو جاتا ہے، جس کی مثال مرزا غالب کے اشعار ہیں۔

اور میری اس تحریر کو مبالغہ پر محمول نہ کیا جائے تو عرض کرنے کی جرأت کروں گا کہ سرؔیر کو بھی اس سلسلے میں غالب کے آس پاس ہی رکھا جائے گا۔ اس خیال کی وضاحت کے لئے چند اشعار دیکھیں۔

کیا جانے آگے چل کے سرؔیر اور ہوگا کیا
آماجگاہ فتنہ و شر ہے وطن ابھی

☆

اس دور میں ہندو پاک سریر میں مکدر رہتے ہیں
دونوں کو یہی اک حسرت ہے کشمیر نہیں تو کچھ بھی نہیں

☆

اللہ رے مزدور کی ایک ایک گھڑی
کر دیتا ہے گنگا میں بھی دیوار کھڑی

Scanned by CamScanner

اس گھر کو بناتا ہے ، نہیں رہتا جہاں
اک دن بھی غریب نہ تقدیر لڑی

☆

آئے ہیں وہ مجھ سے ووٹ لینے کے لئے
کہتے ہیں ٹکٹ بکس میں دینے کے لئے
بیٹھے ہیں جو کشتیاں ڈبوکر اپنی
اٹھے ہیں وہ ہماری ناؤ کھینے کے لئے

☆

کسی کو نہیں آج لیڈری کا دعویٰ
ہر شخص کو ہے رہبری کا دعویٰ
کیا اور کہوں خود فراموش نہ کہوں
شیطان کو ہے پیغمبری کا دعویٰ

☆

چونی، کھدی، مٹر کھساری، ستو
پلول ، بھنڈی ، کدو ، ٹماٹر ، آلو
بازار میں ہے آج کل ہر چیز گراں
سستا سب سے مگر ہے انساں کا لہو

☆

وطن جنت نشاں تھا ، اتحاد کفر و ایماں سے
ہمیں گنگا کے پانی میں مزا ملتا تھا زمزم کا
مگر اس دور آزادی میں ایسا انقلاب آیا
اسی جنت کا ہر گوشہ نمونہ ہے جہنم کا

یہ تمام اشعار اس بات کے غماز ہیں کہ سرؔیر کی نگاہیں کتنی دور رس اور دور اندیش تھیں۔ آج ہمارے آس پاس جو حالات، حادثات اور واقعات دیکھنے کو مل رہے ہیں۔ ان

Scanned by CamScanner

کی نشان دہی سرؔیر نے اب سے تقریباً پچاس سال قبل کر دی تھی۔ حالانکہ ان اشعار میں سیاسی و سماجی مسائل کی بھرپور عکاسی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ فکر و احساس کا امتزاج تمام تر فنی لوازمات کے ساتھ موجود ہیں۔ فکری اور فنی سطح پر بھی سرؔیر کے اشعار بلندی کو چھوتے نظر آتے ہیں۔

علاّمہ سرؔیر کابری کے مندرجہ بالا شعری مجموعوں کو نظر انداز کر دیا جائے تو بھی سرؔیر کابری اپنے ایک شاہکار ''شاہنامہ ہند'' کی بدولت ہمیشہ اردو شاعری میں زندہ رہیں گے اور اردو شاعری میں جو مقام ''شاہنامہ ایران'' کے خالق فردوسؔی اور ''شاہنامہ اسلام'' کے شاعر حفیظؔ جالندھری کا ہے وہی مقام سرؔیر کابری کا بھی ہے۔ اس لئے کہ ''شاہنامہ ہند'' میں ایک جانب زبان و بیان کی سلاست، شگفتگی، روانی، اور دلکشی کا حسن ہے تو دوسری طرف رزمیہ شاعری کی ایک بہترین مثال بھی ہے۔ اس معرکۃ الآرا ''شاہنامہ ہند'' کے بارے میں نیاز فتح پوری نے لکھا تھا:

> ''جناب سرؔیر کابری کی منظوم تاریخ کے بعض اجزا میری نگاہ سے گذرے اور مجھے بے حد پسند آئے۔ ایسی کتابیں اکثر محاسن شاعری سے خالی ہوتی ہیں لیکن سرؔیر کابری صاحب نے تاریخ کے خشک واقعات کو جس خوبصورتی کے ساتھ نظم کیا ہے از بس قابلِ داد ہے۔''

سرؔیر کابری نے غزلوں کے ساتھ نظموں میں بھی اپنی منفرد پہچان بنائی ہے۔ فکری اور فنی سطح پر اپنے احساسات و جذبات کو جس خوبصورت انداز میں سرؔیر کابری نے پیش کیا، یہ صرف ان کا حصہ ہے۔ ان کی نظموں میں ہر طرح کے موضوعات ملتے ہیں جن میں حسن و عشق کی پاکیزگی اور شگفتگی ہے تو دوسری طرف سیاسی، سماجی، معاشرتی، مذہبی اور اصلاحی احساسات و جذبات بھی پوری طرح جلوہ گر ہیں اور فکری و فنی حسن کی کرشمہ سازیاں بھی ہیں۔ علامہ سرؔیر کابری کی نظمیں ''انقلاب''، ''کرشمۂ آزادی''، ''آزادی اور غلامی''، ''قحط اور جنگ''، ''ہمارا وطن''، ''ہم اور ہماری اقلیت''، ''شکوہ''، ''مزدور کا خون گرم''، ''غریب کا جاڑا''، ''فاقہ کشی کی فریاد''، ''جوانان ہند سے خطاب''، ''بھارت کی بیٹی''، ''یتیم کے آنسو''،

Scanned by CamScanner

''بچہ اور ماں''،'' دوشیزہ کی دعاء''،'' قحط سالی کی برسات''،''ستی''،''بیوہ اور چاندنی رات''،''جوانی''،''نئی بھکارن''،''شام جوانی وصبح پیری''،''کالج کی لڑکیاں''،''زنداں کی عید''،''قحط سالی کی عید''،''اضطراب زلزلہ ۳۴ء''،'' کسان سے دو باتیں''،''خیر مقدم''،''برما کا خونی ورق'' وغیرہ نہ صرف اپنے عہد اور دور کی بھرپور عکاسی کرتی ہیں بلکہ عہد حاضر کی حقیقی تصویر بن کر ابھرتی ہیں ان تمام نظموں میں سریر نے اپنے اردگرد کے ماحول، غربت، افلاس، مجبوری، بے کسی اور استحصال کو بڑے ہی فنکارانہ انداز میں پیش کیا جن میں تاریخی شواہد بھی ہیں۔

یہ نظمیں سریر کابری کی انفرادیت اور عظمت کا بیّن ثبوت ہیں۔ سریر کی شاعری پر وقت کی گرد وقتی طور پر پڑ سکتی ہے۔ لیکن جب کبھی اس گرد کو جھاڑنے کی کوشش کی جائے گی، سریر کے اشعار ہیرے موتیوں کی طرح چمک اٹھیں گے، اس کا مجھے یقین ہے۔

Scanned by CamScanner

پرویز شاہدی

نام : سید اکرام حسین
تخلص : پرویز ، کنیت: شاہدی
ولادت : ۳۰ر ستمبر ۱۹۱۰ء (پٹنہ)
وفات : ۵ر مئی ۱۹۶۸ء (کلکتہ)
نام والد: سید احمد حسین
تعلیم : ایم۔اے (اردو، فارسی) پٹنہ یونیورسیٹی
مشغلہ : معلم
تصنیفات:

۱۔ رقص حیات (مجموعہ کلام) ۱۹۵۷ء
۲۔ تثلیث حیات (مجموعہ کلام) ۱۹۶۸ء

rekhta

Scanned by CamScanner

پرویز شاہدی: ناقدوں کے مقتول شاعر

اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ پرویز شاہدی ترقی پسند شعراء کی صف میں اہم اور ممتاز مقام کے مستحق تھے۔لیکن گروپ ازم اور تنگ نظری کی وجہ سے پرویز شاہدی کو ان کا وہ حق اور مقام نہ مل سکا۔اس امر کا احساس ان کی موت کے بعد بیشتر شعراء و ادبا کو ہوا۔اور اسی شدت احساس نے غالباً ڈاکٹر عبدالمغنی کو پرویز شاہدی نمبر نکالنے پر مجبور کیا۔ ڈاکٹر عبدالمغنی اس نمبر کے سلسلے میں لکھتے ہیں:

> ''ہم نے پرویز شاہدی کو کسی خطے اور علاقے کے شاعر کی حیثیت سے نہیں پیش کیا ہے، بلکہ ہم نے ان کو دور حاضر کی ادبی تاریخ میں جگہ دلانے کی کوشش کی ہے۔ جب کہ ایوان تنقید سے سال بہ سال جاری کی جانے والی فہرستوں میں ان کو مسلسل نظر انداز کیا جاتا رہا ہے۔ یہاں پر ہم نے ادب و تنقید کے تمام پہلوؤں پر سوچ کر پرویز شاہدی کو ایک ایسی حقیقت پسندانہ روشنی میں اور ایک ایسے سنجیدہ و متوازن انداز سے پیش کیا ہے کہ بجائے کوئی تماشا بپا ہونے کے جو ہمارا اصل مقصد ہے وہ پورا ہو جائے اور موصوف کو ترقی پسند شعراء کی صف میں ان کا صحیح مقام مل جائے۔''

لیکن افسوس کہ عبدالمغنی نے جس مقصد کے تحت ''مریخ'' کا پرویز شاہدی نمبر نکالا اور جو امیدیں انہوں نے ناقدین اردو ادب سے وابستہ کی تھیں وہ پوری نہ ہو سکیں اور گروپ ازم

Scanned by CamScanner

اور تعصب کا سلسلہ جاری رہا۔ اس طرح کی گروپ بندی اور تعصب اردو میں کوئی نیا نہیں ہے۔ اردو کے نامور نقاد شمس الرحمٰن فاروقی نے بھی اپنے ایک انٹرویو میں اس جانب ان لفظوں میں اشارہ کیا ہے، وہ فرماتے ہیں:

"ہندو پاک دونوں طرف کے تنقید نگار اپنے پسندیدہ ادیبوں کے گروہ رکھتے ہیں اور اُن سے باہر نکلنا پسند نہیں کرتے۔"

مشہور شاعر مظہر امام کو بھی پرویز شاہدی کے ساتھ نقادوں کے رویّہ کا بخوبی اندازہ تھا، وہ لکھتے ہیں:

"پرویز شاہدی ناقدوں کے مقتول ہیں۔"

حالانکہ پرویز شاہدی کی شاعری کئی اعتبار سے قابلِ قدر ہے۔ خواہ وہ موضوع کے لحاظ سے ہو یا فن کے۔ ان کا مخصوص لب ولہجہ، تخیّل کی بلندی اور فکر کی گہرائی ان کی شاعری کو منفرد بناتی ہے اور یہ خصوصیات پرویز شاہدی کی شاعرانہ عظمت کے اعتراف کے لئے کافی ہیں۔

لیکن اس کے باوجود ناقدین اردو ادب نے ان کے فکر وفن سے بے اعتنائی برتی۔ جس کی ایک اہم وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ پرویز شاہدی ترقی پسند تحریک سے وابستہ رہے اور کچھ حضرات کا ترقی پسند شعراء کے متعلق یہ خیال ہے کہ ان کے یہاں شاعرانہ وارفتگی، اس کے تقاضے، اس کا حسن، اس کی موسیقی، اس کے مخصوص آہنگ، اس کی دلآویزی، اس کی نرمی اور لچک، یہ ساری خصوصیات پس پشت ڈال دی گئیں۔ اور زندگی کے بارے میں مارکسی نقطۂ نظر کی ترویج واشاعت، ترقی پسند شعراء کا اول اور آخر مدعا رہا۔ یعنی شعر کی فنی حیثیت معطل اور مفلوج ہوگئی۔ شاعرانہ تیور معدوم ہوگئے۔ اور ان کی جگہ بلند وبانگ نعروں نے لے لی۔ صرف یہی نہیں بلکہ ترقی پسند اسکول کے شعراء نے موضوعات کی حدیں قائم کرلیں۔ خود پر خارجی حقائق کی عکاسی کی پابندی دلادی۔ اور تو اور ان لوگوں نے شاعری کو تقریباً منشور بنا ڈالا۔ الفاظ ویسے استعمال کئے جاتے جو اس کے منشور کے مطابق تھے۔ شعری محرکات کے کیا تقاضے تھے، شاعرانہ انداز کسے کہتے ہیں، ترقی پسند اسکول کے شاعران امور پر غور کرنے سے قاصر تھے۔

یہ باتیں جن حضرات نے ترقی پسند شعراء کے متعلق کہی ہیں وہ پتا نہیں فیض احمد فیض، مخدوم محی الدین، احمد ندیم قاسمی، علی سردار جعفری۔ کیفی اعظمی، خلیل الرحمٰن اعظمی اور نیاز وغیرہ

Scanned by CamScanner

کی شاعری کو کس خانے میں فٹ کریں گے؟ اس لئے کہ ان تمام شعراء کا شمار ترقی پسند تحریک کے ستونوں میں ہوتا ہے اور یہ سارے شاعر ترقی پسند تحریک سے ابتدا ہی سے وابستہ رہے اور اپنی شاعری میں مارکسی نقطۂ نظر کے واضح اظہار، خوبصورت انداز اور شاعرانہ آہنگ کے ساتھ کرتے ہوئے اردو شاعری میں اہم اور معتبر مقام حاصل کیا۔ میرے خیال سے کچھ ایسی ہی صورت حال پرویز شاہدی کی شاعری کے ساتھ رہی ہے۔

''رقص حیات'' اور ''تثلیث حیات'' پرویز شاہدی کے دو ایسے شعری مجموعے ہیں جو ان کے فکر و فن کے مسلسل ارتقا پذیر ہونے کے ثبوت ہیں۔ پرویز شاہدی اپنی شاعری میں اپنے احساسات و جذبات، مشاہدات و تجربات اور حیات اور کائنات کے اسرار و رموز کو دلکش انداز کے ساتھ برتتے ہوئے نظر آتے ہیں اور اپنے نقطۂ نظر یعنی مارکس اور اینجلز کے خیالات کو بھی خوبصورت اور واضح انداز بیان میں پیش کرتے ہیں۔ پرویز شاہدی کی شاعری کبھی پروپیگنڈہ اور نعرے والی شاعری نہیں رہی بلکہ اپنی ایسی بیشتر نظموں میں، جن میں انھوں نے اپنے نقطۂ نظر کو خاص طور پر پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان میں شعریت اور موسیقیت کا خاص انداز ملتا ہے۔ اس ضمن میں ہم پرویز شاہدی کی مشہور نظمیں مثلاً: اجزا، انقلاب، تلوار، یانگتی کو سلام، روشنی کو ووٹ دو، بونس، انتظار، خوابوں کی سیڑھیاں، تلچھٹ، آگ کی لکیر، پیاسے سپنے، بے چہرگی، تثلیث حیات،، دعوت، ضیافت، تضاد اور شیروانی وغیرہ پیش کر سکتے ہیں۔

نظم ''شیروانی'' کا تجزیہ کیا جائے تو اندازہ ہوگا کہ ان کی یہ نظم غریبوں اور بے کسوں کی زبوں حالی کی ایک مکمل اور واضح تصویر ہے یہ ایک شیروانی کا ہی المیہ نہیں بلکہ لاکھوں کروڑوں انسانوں کی مفلسی اور بد حالی کا المیہ ہے نظم کا ہر مصرعہ طنز بن کر ابھرتا ہے۔ دو بند اس نظم کے ملاحظہ فرمائیں ۔

اے اون کی چہیتی ، اے سرج کی دُلاری
حال رخ صنم کا تھا ، رنگ تجھ پہ طاری
ہر تار سے نمایاں زلفوں کی رشتہ داری
چشم سیاہ خوباں کا نقش سحر کاری
ہے یاد تجھ کو تیری گذری ہوئی جوانی

Scanned by CamScanner

اے میری شیروانی.......

اپنی سہیلیوں کی تجھ کو خبر نہیں ہے
ہم جولیوں کی حالت کیا خستہ تر نہیں ہے
کیا سن رسیدگی کا ان پر اثر نہیں ہے
لاکھوں قمیصوں ، کُرتوں پر کیا نظر نہیں ہے
دولت کو بے زری سے ہے بغض خاندانی

اے میری شیروانی.........

پرویز شاہدی کی اسی طرح کی اور بہت ساری دوسری نظمیں ہیں جن میں فکر کی گہرائی، تخئیل کی بلندی اور فنی بالیدگی کا احساس شدت سے ہوتا ہے اس کے ساتھ ہی ساتھ تشبیہات و استعارات میں ندرت، علامت میں طرفگی اور اسلوب بیان میں تازگی اور خوشگوار تبدیلیاں نظر آتی ہیں۔ خلیل الرحمٰن اعظمی نے پرویز شاہدی کی شاعری سے متاثر ہو کر کچھ ایسی ہی باتوں کی جانب اشارہ کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

"......... ادھر چند برسوں میں پرویز کی شاعری میں چند خوش گوار تبدیلیاں آئی تھیں ۔ خاص طور پر ان کی نظم "بے چہرگی" میں موجودہ دور کا کرب جس خوبصورت اور شاعرانہ انداز میں ابھرا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ پرویز شاہدی کو اپنا راستہ مل گیا ہے۔ اس نظم میں جو بالواسطہ طریقۂ کار اور علامتی انداز اختیار کر گیا ہے اسی سے اندازہ ہوتا ہے کہ پرویز کا ذہن کس قدر متحرک اور زندہ تھا اور انہوں نے نئے نئے شعری مزاج کو کس سلیقے کے ساتھ اپنی انفرادیت کو برقرار رکھتے ہوئے قبول کیا تھا۔"

پرویز شاہدی کی نظم "بے چہرگی" کی ایک جھلک پیش ہے تا کہ خلیل الرحمٰن اعظمی کی درج بالا کہی ہوئی بات کو اسی تناظر میں پرکھا جا سکے:

ہزار پوست استخواں
ہزار لب افسردگی

Scanned by CamScanner

ہزار لب بردہ تشنگی
ہزار مرگ زندگی
یہ پارہ پارہ آدمی
ہزار چہرہ آدمی
نہ کوئی نفس منفرد
نہ کوئی عکس معتبر
بھٹک رہا ہے بے ارادہ صرف اسی تلاش میں
کہ اس کو
چہرہ چاہئے
خود اپنا چہرہ چاہئے
بچھڑ کے جو سسک رہا ہے چہروں کی بھیڑ میں!!
(نظم ''بے چہرگی'')

پرویز نے حقیقتاً اپنی زندگی اور اپنی شاعری دونوں ہی سے خود کو پہچاننے اور جاننے کی سعی کی ہے۔ زندگی کے اجنبی اور نامانوس گوشوں پر ہی نہیں بلکہ دیکھی بھالی اور جانی بوجھی دنیا سے بھی انہوں نے اپنی شاعری کے لئے مواد حاصل کیا ہے اور خوبصورت اور حسین انداز میں پیش کیا ہے۔ اس سلسلے میں پرویز شاہدی ''تثلیث حیات'' کے دیباچہ میں لکھتے ہیں:

''میری زندگی ہو یا میری شاعری دونوں ہی کے سہارے اپنے آپ کو پہچاننے کی کوشش کی ہے اور احساس ناکامی کے باوجود اعتراف شکست کے لیے تیار نہیں۔ میں زندگی کے نامانوس اور اجنبی گوشوں ہی سے متعارف ہونے کا متمنی نہیں۔ بلکہ بار بار دیکھی بھالی دنیا سے بھی تجدید تعارف کرتے رہنے کا آرزومند ہوں۔ میں نے اپنی شاعری کے آئینے میں بھی اپنا چہرہ ڈھونڈنے کی کوشش کی ہے۔ کبھی کبھی اس کی ہلکی سی جھلک نظر آئی اور خلائیں کھو گئیں۔''

پرویز شاہدی کی نظموں میں جس طرح قابلِ قدر نمونے ملتے ہیں ٹھیک اسی طرح

Scanned by CamScanner

غزلوں میں بھی ان کا منفرد انداز بیان اور شعری آہنگ خوبصورت لب ولہجہ کے ساتھ ملتا ہے۔ نئے موضوعات کو کلاسیکی مزاج کے ساتھ برتنے میں پرویز شاہدی کا اپنا ایک مخصوص اور منفرد انداز ہے۔ چند اشعار غزلوں کے ملاحظہ فرمائیں۔

میری دشمن میری فریاد ہے معلوم نہ تھا
ہمنوا ہی مرا صیاد ہے معلوم نہ تھا
بوئے گل موج صبا ذوق نمو سب پابند
ایک صرصر کی جو آواز ہے معلوم نہ تھا

☆

تھا کارواں ہی سہل پسندوں پر مشتمل
کیا راز تھا بتائیں کہ دشوار کیوں ہوئے

☆

سہارا آندھیوں کو دے دیا کس شاخ نرگس نے
تصور سے بھی کچھ اونچی تھیں دیواریں گلستاں کی

☆

ہر پنکھڑی کو اپنا ہی دامن نہ سمجھ لیں
ناموس گل کو جامہ دروں سے بچایئے

☆

تھے اہم راہ میں کعبہ و دیر بھی
بڑھ گیا ان سے آگے بشر ہی تو تھا

☆

پرویز شاہدی کی شاعرانہ عظمت کا اعتراف ایک نہ ایک دن ضرور کیا جائے گا۔ اس کا مجھے یقین ہے اس لئے کہ بقول ڈاکٹر اختر اورینوی:

''پرویز شاہدی اردو ادب کے ایک شاعر تھے اور ان کا فن ہمیشہ قد آور اور زندہ رہے گا۔''

☆☆

Scanned by CamScanner

مظہر امام

نام : سید مظہر امام
تخلص : امام
ولادت : ۵؍مارچ ۱۹۳۰ (مونگیر، بہار)
نام والد : سید امیر علی
تعلیم : ایم۔اے (فارسی اور اردو)
مشغلہ : ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے اعلیٰ عہدے سے سبکدوش

شعری تصنیفات:

۱۔ زخم تمنا (نظمیں، غزلیں) ۱۹۶۲ء
۲۔ رشتہ گونگے سفر کا (نظمیں، غزلیں) ۱۹۷۴ء
۳۔ پچھلے موسم کا پھول (غزلیں) ۱۹۸۸ء (ساہتیہ اکادمی ایوارڈ ملا)
۴۔ بند ہوتا ہوا بازار (نظمیں) ۱۹۹۲ء

rekhta

Scanned by CamScanner

مظہر امام: جدید اردو شاعری کا امام

مظہر امام واقعی خوش نصیب شاعر ہیں کہ ان کے ہم عصروں کے مقابلے میں ان پر بہت زیادہ لکھا گیا۔ جس کی وجہ ان کا منفرد لب ولہجہ خوب صورت اسلوب اور فکر وفن کا حسین امتزاج اور تازگی و شگفتگی ہے۔

مظہر امام کی شاعری کے ابتدائی دور پر ہم ایک نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں ان کے یہاں بھی رومان پرور ماحول اور حسن و شباب کی کھلی فضا ملتی ہے۔ اور یہ رومان پرور ماحول اور یہ کھلی کھلی حسن و شباب کی فضا تصوراتی نہیں ہے بلکہ احساسات و جذبات میں ڈوبی ہوئی پر کیف اور پر اثر کیفیتیں ہیں۔

تری نظر میں حیا نے جو لی اک انگڑائی
مری نگاہ میں میرا سوال شرمایا

☆

امام دشت محبت میں اک سہارا ہے
کسی حسین کے سجل روپ کا گھنا سایا

☆

آپ کو میرے تعارف کی ضرورت کیا ہے
میں وہی ہوں کہ جسے آپ نے چاہا تھا کبھی

☆

Scanned by CamScanner

اپنی وفاؤں پر بھی ندامت ہوئی مجھے
وہ اس قدر تھے اپنی جفاؤں پہ شرمسار

☆

تو میرے انتظار میں ہوگی
میری یادوں کے نرم و نازک لب
تیرے خوابوں کو چومتے ہوں گے
میری باتوں کے میگھ دوت اکثر
دل کی وادی میں گھومتے ہوں گے

(انتظار)

حسن وعشق کی خواب آور فضاؤں کے بعد جب مظہر امام زندگی کی تلخ حقیقتوں سے دوچار ہوئے تو زندگی کی تلخیوں کو گھونٹ گھونٹ پینے لگے۔ وہ خود کہتے ہیں:

''قومی اور بین الاقوامی انتشار نے ایقان واعتماد کی دیواروں کو متزلزل کردیا۔ زندگی کی عزیز قدریں، آہستہ آہستہ فنا ہو رہی، فریب، ریا، تنگ نظری، جانب داری اور خود غرضی کی بڑی کریہہ صورتیں سامنے آئیں۔ احباب کی شفقتوں نے پرانے زخموں پر نمک پاشی بھی کی اور نئے زخموں کا اضافہ بھی کیا........

زندگی کی شکستوں اور تلخ تجربوں نے جن کی نوعیت ایک دوسرے سے قطعی مختلف تھی۔ میری روح میں یاس وتلخی کا زہر گھول دیا۔ غالباً یہ میرے حق میں اچھا ہی ہوا کیونکہ اس کے بغیر شاید میں اپنے عہد کے مزاج سے نا آشنا اور اپنے ہم عصروں کے لئے اجنبی رہتا۔''

(زخم تمنا، ص:۱۳)

زندگی کی تلخیوں، کربناکیوں، محرومیوں اور مایوسیوں سے مظہر امام متاثر ہوتے ہیں لیکن فرار حاصل نہیں کرتے۔ بلکہ وہ ان سے نبرد آزما رہنے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔

Scanned by CamScanner

روز ازل سے تر شئ حالات ہے نصیب
پھر بھی مئے حیات کا اترا نہیں خمار

☆

دوستوں سے ملاقات کی شام ہے
یہ سزا کاٹ کر اپنے گھر جاؤں گا

☆

سناٹے کے گہرے پن میں گم ہے اپنی بھی آواز
ڈھونڈ کے لاؤں کوئی دشمن اس سے دو دو بات کروں

مظہر امام کی شاعری عہد حاضر کی تمام تر کیفیات اور اس کے اسرار و رموز سے جڑی ہوئی ہے۔ خوف اور عدم تحفظ کا احساس افسردگی،، بے زاری، بے بسی، بے کیفی، بے چہرگی، درد و کرب، گھٹن شکستگی، ذات کا کرب اور احساس تنہائی وغیرہ جو عصر حاضر کی دین ہیں ان کا اظہار پورے فنی حسن اور فکری بالیدگی کے ساتھ مظہر امام کے یہاں موجود ہیں۔ ایسے لمحات کے اظہار میں مظہر امام کسی شاعر کی تقلید نہیں کرتے۔ بلکہ وہ جو دیکھتے اور جھیلتے ہیں انہیں بڑے خلوص اور اعتماد کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ اور چونکہ مظہر امام نے اپنا لب و لہجہ، اپنا اسلوب اور اپنی آواز کو خود تراشا ہے اس لئے ان کے فکر و احساس میں تنوع، لب و لہجہ اور اسلوب میں ایک ایسی انفرادیت جھلکتی ہے جن سے مظہر امام کو بہ آسانی پہچانا جا سکتا ہے۔ شوخی، شائستگی اور شگفتگی بھی مظہر امام کے اہم اوصاف ہیں، جو مظہر امام کے Originality اور Identity کے نمایاں ثبوت ہیں۔

میں تو اس حشر تماشا میں خدا بن کے رہا
تو بھی اس بھیڑ میں ہوتا تو اکیلا ہوتا

☆

تیشہ اٹھا لیا ہے تو اب جو بھی زد میں آئے
اس راستے میں تیری عمارت بھی آئے گی

Scanned by CamScanner

جس سے کترا کے نکلتے رہے برسوں سر راہ
اس سے کل ہاتھ ملایا تو وہ اپنا نکلا

☆

خوشی سے آگ لگاؤ کہ اس محلّے میں
مرا مکان ہی نہیں تمہارا گھر بھی ہے

☆

دیواریں ہل رہی ہیں زماں و مکاں کی
گرتا ہوا یہ گھر کوئی آکر سنبھال دے

☆

کاش اب اپنی تمنا کا خدا ہوجاؤں
وہ ہمہ گوش ہے بے صوت و صدا ہوجاؤں

☆

کیوں خود کو نہ چاہوں کہ ترا دل تو نہیں میں
کیوں خود سے بچھڑ جاؤں کہ تجھ سا تو نہیں ہوں

مظہر امام کے یہاں کوئی تاثر، کوئی کیفیت، کوئی خیال اور کوئی احساس آورد کا نتیجہ نہیں۔ بلکہ ہر جگہ آمد ہی آمد ہے اور ان میں شعریت کے ساتھ ساتھ فکر و معنی کی تہہ در تہہ حسن ملتا ہے۔ بعض فکری پہلو مظہر امام کے یہاں ایسے ہیں جن پر فلسفہ کا گمان ہوتا ہے۔ لیکن درحقیقت یہ فلسفہ نہیں ہے، بلکہ حیات و کائنات کے درد و داغ، جستجو و آرزو اور اس کے اسرار رموز ہیں۔ اور ان کیفیات کے اظہار و احساس کے لئے مظہر امام علامتوں استعاروں اور تشبیہوں کا بھی خوبصورت استعمال کرتے ہیں اور اپنے فکر و خیال کو گنجلک، لایعنی اور ابہام سے بچاتے ہوئے گہری معنویت پیدا کرتے ہیں اور تراشے گئے استعارے علامتیں یا تشبیہیں اشعار میں جزو لاینفک کی حیثیت اختیار کر لیتے ہیں۔ یہ کیفیتیں غزلوں کے ساتھ ساتھ نظموں میں بھی بڑے حسین انداز میں ملتی ہیں چند نمونے دیکھئے۔

Scanned by CamScanner

سوچتا ہوں کہ تجھے کون سا تحفہ بھیجوں؟
اپنے ہونٹوں کی جلن، اپنی نگاہوں کی تھکن!
اپنے سینے کی گھٹن، اپنی امنگوں کا کفن!
جادۂ زیست پہ بکھرے ہوئے کانٹوں کی چبھن!
عمر بھر کا سرمایہ یہی ہے اے دوست!
(تحفہ)

میں بھٹکا ہوں
کتنے سرابوں میں صحراؤں میں
کئی کارواں مجھ سے آگے گئے
ان کے نقش پا ابھی مشتعل ہیں
ابھی دھول نے ان پہ چادر بچھائی نہیں ہے
مجھ سے پیچھے
نئے کاروانوں کی گرد اڑ رہی ہے
کچھ جیالے جوان
تازہ دم، تیز رو
اور میں
وقت کی رہ گزر کا وہ تنہا مسافر
جو ہر قافلے سے الگ
رہ رؤں سے الگ
اجنبی سمت
یوں چل رہا ہے
کہ اس کے سوا کوئی صورت نہیں ہے
(رشتہ گونگے سفر کا)

Scanned by CamScanner

حسرت و غم کی تپش ریزگزر گا ہوں پر!
میرے رہتے ہوئے چھالوں کے نشاں ملتے ہیں
زیست دم بھر کو جہاں بیٹھ کے ستاتی ہے
اب وہ پیپل کے گھنے سائے کہاں ملتے ہیں
(کھویا ہوا چہرہ)

میں اب وہ نہیں ہوں
جو میں تھا
اب اک مُردہ انسان کا کوٹ میرے بدن کی کثافت چھپائے ہوئے ہے
میں برسوں کی رسوائیاں
اس کی بوسیدہ جیبوں میں مدفون کرنے میں مصروف ہوں
(تمہارے لئے ایک نظم)

عقیدے نیزوں کی زخم کھا کر سسک رہے ہیں
یقین کی سانس اکھڑ چکی ہے
نڈھال خوابوں کے ہونٹ سے خاک وخوں کے شعلے ابل رہے ہیں
عزیز قدروں پہ جانکنی کی گرفت مضبوط ہوگئی ہے
پتنگ کی طرح کٹ چکے ہیں تمام رشتے
جو آدمی کو قریب کرتے تھے آدمی سے

(اکھڑتے خیموں کا درد)

ان کے علاوہ مظہر امام کی بعض نظمیں مثلاً پوسٹ نہ ہونے والا ایک خط، ٹھہرے ہوئے لمحے سے پرے، چلوائے امام، اے دوست، شعاع فردا کے راز دانو، خواب سچ بھی ہوتے ہیں، آنگن میں ایک شام، اور گوشت کا نغمہ وغیرہ ایسی ہیں جن میں مظہر امام کی شاعری معیار کی بلندیوں پر نظر آتی ہیں۔

مظہر امام پر ایک الزام یہ ہے کہ :

''ہندوستان میں جدیدیت کے فروغ کے بعد وہ بہت سے اردو شعراء

Scanned by CamScanner

کی طرح ترقی پسند تحریک کے دھارے سے کٹ کر علیحدہ ہو گئے۔
ان کی دانست میں ترقی پسندی فکر و نظر کے کٹر پن کا دوسرا نام تھا۔ یہ
چیز ان کے لئے شجر ممنوعہ بن گئی اور جدید شاعروں کے ساتھ ہو گئے۔
اس سلسلے میں میرا ذاتی احساس یہ ہے کہ فکر و نظر کے کٹر پن کی بات
محض ایک بہانہ تھی۔ ان کو دراصل جدیدیت میں کشش نظر آئی۔ آدمی
نہایت ذہین اور نباض ہیں۔ اس لئے ان کی سمجھ میں یہ بات آ گئی کہ
اب جدیدیت کا ہی بول بالا ہو گا، اور ترقی پسندی رفتہ رفتہ ماند پڑ
جائے گی۔ اس لئے تحفظ شہرت کی خاطر انہوں نے ادب کے ترقی
پسند نظریہ کو خیر باد کہا اور جدید شعرا کی محفل میں چلے آئے۔''

(اویس احمد دوراں، گوشۂ مظہر امام، شاعر ص: ۲۸)

میرا خیال ہے کہ مظہر امام پر یہ الزام غلط اور بے بنیاد ہے، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ مظہر امام نہ تو ''تحفظ شہرت'' کے لئے ''جدید شعراء'' کی محفل میں آئے اور نہ ہی ترقی پسند تحریک کے کٹر پن کی وجہ کر، بلکہ مظہر امام نے شاعری کی ارتقائی منزلوں کو طے کیا ہے۔

آج ہم جن حالات، حادثات، واقعات سے گزر رہے ہیں وہ یقینی طور پر کل نہیں تھے یا آج جو ہیں وہ کل نہیں ہوں گے۔ ترقی پسند تحریک کے زمانے میں جو سیاسی، سماجی اور معاشرتی ڈھانچہ تھا وہ آج بدلی ہوئی شکل میں ہمارے سامنے ہے۔ اور پھر شاعر و ادیب تو وقت کا نباض ہوتا ہے۔ اپنے آس پاس کے ماحول یا پھر ذاتی احوال کو وہ بیان کرتا ہے۔ موجودہ عہد میں ذات کا کرب، تنہائی، محرومی، مایوسی، گھٹن، بے چہرگی، ظلم، بربریت، ناانصافی، استحصال وغیرہ زندگی کے ہر موڑ پر موجود ہیں۔ پھر ان سے شاعر کا متاثر ہونا بالکل فطری عمل ہے۔ اگر مظہر امام کی شاعری اور فکر و احساس میں عہد حاضر کی جھلکیاں موجود نہ ہوتیں اور وہ گل و بلبل، حسن و عشق اور ہجر و وصال کی باتیں کرتے ہوتے تو یقینی طور پر مظہر امام کی آج جو مقبولیت ہے وہ نہ ہوتی۔ بلکہ انہیں Out dated قرار دے کر فراموش کر دیا جاتا۔

مظہر امام کی سب سے بڑی کامیابی یہی ہے کہ انہوں نے بدلتے ہوئے وقت اور

Scanned by CamScanner

حالات کی عکاسی کی ہے اور اپنی فکری بصیرت اور فنی آگہی سے غزلوں اور نظموں میں نت نئے گل و بوٹے کھلائے ہیں اور عصری حسیت اور جدید تقاضوں کو پورا کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مظہر امام کی شاعرانہ عظمت کا اعتراف مظہر امام کے ہم عصر شعراء، اور پیش رو شعراء کے ساتھ ساتھ کئی اہم ناقدین ادب نے کیا ہے۔ چند مشاہیر کے تاثرات پیش ہیں:

''ابھی کل کی بات ہے کہ وہ ننھا سا سہما سہما دیا جو کلکتہ کی ادبی مجالس میں روشن ہوا تھا دیکھتے دیکھتے ستارہ بن کر اپنی روشنی دور دور تک پھیلانے لگا۔''
(جمیل مظہری)

''مظہر امام کی شاعری لطافت احساس اور طہارت فکر کی خوبصورت مثال ہے۔ ان کے یہاں ایک چٹیلا پن اور نشاط آمیز دل گرفتگی ہے جو ان کے کلام کو انفرادیت بھی عطا کرتی ہے اور دل نوازی بھی۔''

(فراق گورکھپوری)

''مظہر امام کے کلام میں زبان و بیان کی پختگی، لہجے کی سنجیدگی، جذبے کی شدت اور بدلتے ہوئے حالات کا شعور بھرپور موجود ہے۔ انہوں نے اپنی شاعری میں جذبات و تاثرات کے ساتھ عصری رجحانات کا اظہار کیا ہے۔ اور یہ ان کے کامیاب شاعر ہونے کی دلیل ہے۔''
(غلام ربانی تاباں)

یہ تاثرات ہیں مظہر امام کے پیش رو ممتاز اور اہم شعرا کے۔ اب دیکھئے کہ ان کے ہم عصران کے بارے میں کیسی رائے رکھتے ہیں:

ان (مظہر امام) کی شاعری میں وہ تمام عناصر بدرجہ اتم موجود ہیں جو اچھی اور سچی شاعری میں ہوتے ہیں۔''

(شہریار)

''آپ (مظہر امام) ان چند شاعروں میں ہیں جو سوچ سمجھ کر لکھتے ہیں اور جن کے یہاں کہنے کے لئے کوئی نہ کوئی نئی بات ہوتی ہے

Scanned by CamScanner

آپ جدید ہیئتوں میں تجربے کر رہے ہیں وہ بھی قابل قدر ہیں۔''

(وحید اختر)

''ایک عمر سے تمہارا (مظہر امام) کلام پڑھتا ہوں اور تمہیں اپنے قبیلے کے شاعروں کا پیش رو سمجھتا ہوں۔ تمہاری شاعری مجھے جان سے عزیز ہے۔''

(باقی)

''مظہر امام ان معدودے چند شعراء میں ہیں جنھیں اپنا ہم عصر اور ہم سفر سمجھنے میں مجھے ہمیشہ مسرت محسوس ہوتی ہے۔''

(خلیل الرحمٰن اعظمی)

مظہر امام کی شاعری کی تازگی، شگفتگی، روایت کی پاسداری، جدید حسیت، عصری تقاضوں کا احساس، فکری اور فنی آگہی و عرفان اشارے و کنائے میں گہری معنویت پیدا ہونے والی باتیں منفرد لب ولہجہ، مخصوص اسلوب اور حیات و کائنات کے گہرے شعور نے ایک ایسی فضا پیدا کر دی کہ ناقدین اردو ادب کو کہنا پڑا کہ:

''مظہر امام ہمارے ان ممتاز شعراء میں سے ہیں جن کے یہاں عصری میلانات اور نئی حسیت کی عکاسی کے ساتھ اپنی ساری ادبی روایت کا عرفان بھی ملتا ہے۔ ان کے یہاں غم و غصہ یا بیزاری کے بجائے ایک سچے فنکار کا گمبھیر لہجہ ہے۔''

(آل احمد سرور)

''مظہر امام کو اپنے لہجے کی انفرادیت ثابت کرنے کے لئے کسی خارجی سہارے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ حیات و کائنات سے ان کا رشتہ ہی ایسا ہے کہ اس کا تصور کسی روایتی فکر سے وابستہ نہیں کیا جا سکتا۔''

(شمس الرحمٰن فاروقی)

''مظہر امام کی شاعری سلگتے ہوئے قلب، دھڑکتے ہوئے ذہن، دہکتے ہوئے شعور اور ہانپتے ہوخوابوں کی شاعری ہے۔ ایک بے پایاں درد ایک مستقل کرب، جو ان کی ہی تخلیق میں چمک اٹھتا

Scanned by CamScanner

ہے۔ وہی اس درد سے اس زندگی سے اور خود اپنی شاعری سے ان
کے رشتوں کا شناختی نشان ہے۔"

(قمر رئیس)

"میں مظہر امام کی نظمیں اور غزلیں بڑے شوق سے پڑھتا ہوں۔
اظہار بیان کی تازگی کی وجہ سے وہ فوراً اپنی جانب متوجہ کر لیتی
ہیں۔ مظہر امام نے اشاریت اور سپاٹ اظہار کے درمیان ایک
راستہ نکالا ہے، جو نہ تو ابہام کی طرف جاتا ہے نہ فرسودگی کی
جانب، بلکہ تازگی اور تنوع کا احساس دلاتا ہے۔"

(احتشام حسین)

"مظہر امام ہماری شاعری میں کسی دھماکے سے داخل نہیں ہوئے۔
انہوں نے فکر و خیال کو خلوص و درد کی دھیمی آنچ میں تپا کر اپنے لئے رفتہ
رفتہ جگہ پیدا کی ہے۔ ان کی شاعری کا رخ نئے تقاضوں کی طرف ہے
لیکن فنی سطح پر انہوں نے روایت سے اپنا رشتہ نہیں توڑا۔ اس سے ان
کے اسلوب واظہار میں ایک خوش آہنگی اور بے تکلفی آ گئی ہے۔"

(گوپی چند نارنگ)

"مظہر امام کی شاعری کے پس پشت زندہ رہنے کی ایک تیز خواہش
موجود ہے۔ لیکن خواہش اور تکمیل خواہش کے درمیان حادثات
پیہم کے عفریت سینہ تان کے کھڑے ہو گئے ہیں۔ چنانچہ شاعر
نے آئینۂ دل کے چور چور ہو جانے کی ہزار کیفیتوں کو اپنی نظموں
میں سمو لیا ہے۔" (وزیر آغا)

(مظہر امام: ایک تعارف۔ مرتبہ مناظر عاشق ہرگانوی)

یہ تنقیدی تاثرات بھی مظہر امام کی شعری عظمت کے بین ثبوت ہیں۔ مظہر امام کی فکری
اور فنی بصیرت کی وجہ کر انہیں اردو شاعری خصوصاً اردو کی جدید غزل اور نظم کا صف اول کا شاعر
قرار دیا جا سکتا ہے۔ ☆☆

Scanned by CamScanner

فرحت قادری

نام : سید ابوالفرح ذوالنون محمد جاہ

تخلص : فرحتؔ

ولادت : ۶ر جنوری ۱۹۲۸ء، بروز جمعہ (اوگانواں، پٹنہ)

نام والد : حکیم سید ابوالظفر محمد قادری

شعری تصنیفات:

۱۔ زمین ہند (قومی نظمیں)	۱۹۶۸ء
۲۔ کائنات غم (شعری مجموعہ)	۱۹۷۵ء
۳۔ ضروریات شعروادب (عروض وبلاغت)	۱۹۸۱ء
۴۔ شیشے اور پتھر (شعری مجموعہ)	۱۹۸۳ء
۵۔ رقص وعکس (حمد، نعت، دینی وملی نظمیں)	۱۹۸۸ء
۶۔ ایک جام اور (غزلوں کا مجموعہ)	۱۹۹۷ء
۷۔ اندھیرے کے مسافر (نظمیں)	۱۹۹۹ء

rekhta

Scanned by CamScanner

فرحت قادری: دورِ جدید کا میرؔ

فرحت قادری، اردو شاعری کا کافی جانا پہچانا اور معتبر نام ہے۔ گزشتہ کئی دہائیوں سے اردو شاعری میں اپنے نت نئے احساسات و جذبات کو فکر و فن کی اعلیٰ قدروں کے ساتھ پیش کر کے اردو شاعری کی عظمت، وقار اور معیار میں اضافہ کیا ہے۔ لیکن افسوس کا مقام ہے کہ آج کے اس گروپ ازم اور تنگ نظری کے ماحول میں فرحت قادری جیسے حساس اور بے باک شاعر کو وہ مقام نہ مل سکا، جس کے وہ مستحق تھے۔ اس کرب کا اظہار خود فرحت قادری نے اپنی مختلف تحریروں میں کیا ہے۔ ''زمین ہند'' کے صفحہ ۱۸ پر وہ رقمطراز ہیں۔

> ''میں صوبہ بہار کا ایک گمنام اور اردو زبان کا ایک بدقسمت شاعر ہوں۔ تقریباً پچاس سال سے گیسوئے اردو کی مشاطگی کرتے کرتے اور قومی نظمیں لکھتے لکھتے میرے بدن کا رواں رواں سفید ہو گیا لیکن صلہ کیا ملا.... فقط گمنامی اور تنگ دستی!''

فنکار فرحت قادری کی تنگ دستی نے اردو شاعری کو مالا مال تو کیا، لیکن اس تنگ دستی نے فرحت قادری کو گمنامی کے اندھیرے سے نکلنے نہیں دیا۔ ہاں، فرحت قادری اگر بہت بڑے تاجر یا افسر ہوتے اور شاعر معمولی درجہ کے بھی ہوتے تو ہمارے اردو کے نامور نقادان کے فکر و فن پر زمین و آسمان کے قلابے ملا دیتے اور صفحات کے صفحات سیاہ کر ڈالتے۔ کتنے مقالے کتنی کتابیں اور نہ جانے کتنے رسالوں کے خصوصی نمبر نکال ڈالتے۔ بھلا ہو ماہنامہ

Scanned by CamScanner

''سہیل'' (گیا) کے مدیر جناب مسعود نظر، جنھوں نے میری خواہش پر اپنے شہر کے گوشۂ گمنامی میں پڑے اس عظیم اور بزرگ شاعر پر ایک خصوصی نمبر نکالنے کا ارادہ کیا۔

فرحت قادری کی شاعری کی ابتدا ۱۹۴۰ء کے آس پاس ہوتی ہے۔اس وقت کے حالات، جو کئی لحاظ سے اب تاریخی حیثیت اختیار کر چکے ہیں۔ان بدلتے ہوئے وقت اور رجحانات کا پرتو فرحت قادری کی شاعری میں پوری شدت کے ساتھ موجود ہے۔قومی نظریہ بڑی تیزی سے لوگوں کے دلوں میں اپنی جگہ بنا چکا تھا۔ ہزاروں لاکھوں انسانوں کی قربانیوں کے بعد ملک کو آزادی ملی۔پھر اس کا بٹوارہ اور اس کے ساتھ ہی پورے ملک میں فرقہ واریت کے اٹھتے ہوئے شعلوں نے ہر حساس ذہن کو فکر مند کیا اور ان ہی افکار و احساس کا برملا اظہار فرحت قادری کی ابتدائی شاعری میں بڑی جذباتیت کے ساتھ دیکھنے کو ملتی ہے۔فرحت قادری کی پہلی شعری کاوش کہاں اور کب شائع ہوئی۔اس کا ذکر نہیں ملتا۔لیکن فرحت قادری کی پہلی کتاب ''زمین ہند'' جو قومی نظموں کا مجموعہ ہے، اس میں پہلی نظم مولانا حسین احمد مدنیؒ پر ہے، جو ۱۹۴۲ء کی تحریک آزادی میں ان کی گرفتاری سے متاثر ہو کر اگست ۱۹۴۲ء میں لکھی گئی تھی۔اس نظم کا ایک بند اس طرح ہے۔

جہاد فی سبیل اللہ مجسم جس کی تربیت
سراپا منکسر اخلاق سے معمور شخصیت
یہ وقت درس اسلامی کوئی دیکھے تو کیفیت
تمنا ہے اسی صحبت میں گزرے زندگی فرحت

صرف اس بند کے مطالعہ سے شاعر کی خود اعتمادی اور فکر و فن پر گہری نظر کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔''زمین ہند'' کا دوسرا ایڈیشن ۱۹۹۳ء میں منظر عام پر آیا ہے۔اس مجموعہ کی تمام نظمیں قومی یکجہتی اور قومی نظریہ کی بھرپور تائید کرتی ہوئی۔فکر و احساس کی ایک پوری دنیا آباد کرتی نظر آتی ہیں۔ایک حساس اور حب الوطن شاعر کا دل ہر اس لمحہ بے چین اور بے قرار ہوا ہے، جب جب ملک کی سالمیت اس کی تہذیب و تمدن، اس کی روایت اور یکجہتی پر کوئی آنچ آئی ہے اور اس آنچ سے شاعر پوری طرح شعلہ بار ہو کر اپنے احساسات و جذبات کو نظموں میں پوری فنی اور فکری عظمتوں کے ساتھ قلم بند کرتا ہے۔مشاہدات، نعرۂ آزادی، مجاہدِ حریت،

Scanned by CamScanner

ترانۂ وطن، قدم ملا کے چلو، ہندوستان جنت نشان، ہندوستان کا جھنڈا، سیما سے ہٹ جاؤ، بھارتی نوجوانوں سے، زمین ہند، وطن کے لئے، اے جنت کشمیر، للکار، ہند کی سرزمین، انسانیت کا ترانہ، فسادیوں سے، قومی ایکتا، چھبیس جنوری، نیا سال، پندرہ اگست اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی وغیرہ نظمیں ایسی ہیں جو نہ صرف حُب الوطنی بلکہ انسانیت کے فکرواحساس کو معنی ومفہوم عطا کر کے دل ودماغ کو جھنجھوڑ کر قوم پرستی کا اعلیٰ نمونہ پیش کرتی ہیں۔ ''زمین ہند'' کے تعارف میں علامہ ابراحسنی گنوری کی بات حقیقت سے بے حد قریب نظر آتی ہے، وہ لکھتے ہیں:

''شاعر جب قوم ووطن کو قابلِ اطمینان حالت میں نہیں پاتا تو اس کا دل تڑپ جاتا ہے۔ اور ہر تڑپ درد، خلوص اور جذبۂ سرفروشی میں ڈوبی ہوئی ایک نظم بن جاتی ہے۔''

آج جب کہ ہمارے ملک میں فرقہ پرستی کا زہر بڑی تیزی سے پھیل رہا ہے، ملک کے ٹکڑے ٹکڑے کر دینے کی خواہش رچی جارہی ہے۔ فرقہ وارانہ فسادات سے ملک کے خوبصورت چہرے کو داغ دار اور کریہہ بنایا جارہا ہے۔ علیحدگی پسند قوتیں بڑی تیزی سے سر اٹھا رہی ہیں اور اپنے ملک کی شاندار تاریخی روایتوں کو فراموش کیا جارہا ہے۔ ایسے ناگفتہ بہ حالات میں فرحت قادری جن کے دل میں امن وآشتی اور حب الوطنی کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا ہے، کی یہ تمام نظمیں جذبۂ قومیت اور احساس وطن پرستی کو جگانے میں نہ صرف بے حد کامیاب ہیں، بلکہ قارئین کو دعوتِ فکر بھی دیتی ہیں۔ ''زمین ہند'' پر تبصرہ کرتے ہوئے بدر اورنگ آبادی نے بڑی اچھی اور سچی بات لکھی ہے کہ:

''چین کی جارحیت ہو یا پاکستان کی۔ سقوط ڈھاکہ ہو یا قصبۂ گوا امن کا اعلانیہ مصالحت تاشقند ہو یا شملہ معاہدہ، فسادیوں کی لرزہ خیز داستان ہو یا جہیز کی لعنت، پندرہ اگست کی تابانیاں ہوں یا چھبیس جنوری کی شان جمہوریت، پونجی پتیوں کا ظلم و جور ہو یا نیتاؤں کا لبادہ اوڑھے غنڈوں کی ستم گری، اپنے وطن میں وقوع پذیر ہر سانحہ، ہر تحریک ہر واقعہ اور ہر عمل نے فرحت قادری کے

Scanned by CamScanner

دل کو تڑپایا ہے، جھنجھوڑا ہے، نتیجتاً فرحت قادری کی نظموں میں اپنے وطن کی خوشبو کے ساتھ ساتھ مسرتوں اور شادمانیوں کی جلوہ گری ہے تو دوسری طرف شاعر کے کرب والم کی گہری لکیریں بھی ملتی ہیں۔ (بودھ دھرتی)

فرحت قادری کا شعری سرمایہ گزشتہ پچاس سالوں میں چھ شعری مجموعوں کی شکل میں ہمارے سامنے موجود ہے۔

ان شعری مجموعوں کے مطالعہ سے جو نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے، وہ ہے فرحت قادری کی شاعری میں جذبۂ حب الوطنی اور بدلتے ہوئے سیاسی، سماجی و معاشرتی اقدار، یہی وہ موضوعات ہیں، جو فرحت قادری کی شاعری میں پوری طرح رچے بسے ہیں۔ حسن و عشق کو بھی فرحت قادری نے اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے۔ لیکن مدرسہ کی تعلیم، گھر کا دینی ماحول اور ابتدائی شاعری کے دنوں میں ملک کے بدلتے اور بکھرتے حالات نے فرحت قادری کو حسن وعشق سے غالباً فکری طور پر دور رکھا۔ ویسے جا بجا جہاں پر بھی فرحت قادری نے انہیں اپنا موضوع سخن بنایا ہے وہاں پر فکر وفن کی بلندیاں تمام تر رعنائیوں اور شگفتگی کے ساتھ موجود ہیں۔ غزل کے چند اشعار اس امر کے ثبوت ہیں۔

نظر میں قہر ہے، رخسار ہیں غضب آلود
سکوت لب میں ہیں فتنے ہزار پوشیدہ
یہ کس مقام پر تم کھینچ کے آ گئے فرحت
یہاں گلوں کی قبا میں ہیں خار پوشیدہ

یہاں تو صرف میں ہوں اور تو ہے
ادا کیا، ناز کیا، شرم و حیا کیا

Scanned by CamScanner

اُف وہ حسنِ شباب کا عالم
حسن کو جب خبر نہیں ہوتی

وہ ادا ادا میں حلاوتیں ، وہ قدم قدم پہ قیامتیں
وہ حیا میں ڈوبی نظر ، مجھے سب یاد ہے ذرا ذرا

مجھ کو تنہائیوں کا گلہ کچھ نہیں
سانس بن بن کے آپ آتے جاتے رہے

حسن ووفا، عشق و جفا کی یہ خوبصورت تصویریں فرحت قادری کے یہاں شاذ و نادر ہی دیکھنے کو ملتی ہیں۔اس کی وجہ مندرجہ بالا سطور میں بتائی گئی ہے۔فرحت قادری کی شاعری میں جو موضوع سبسے زیادہ جگہ پاتا ہے، وہ ہے غم، کرب، گھٹن، درد، بے بسی، اور مجبوری، یہ تمام موضوعات بڑے جذباتیت کے ساتھ فرحت قادری کی شاعری کے موضوع بنتے ہیں اور چونکہ خود شاعر ان تمام حالات سے بذات خود نبرد آزما رہا ہے۔اس لئے کبھی ان حالات کا کرب رلاتا ہے، کبھی تڑپاتا ہے، کبھی ناامید کرتا ہے۔کبھی اندر ہی اندر بکھرتا ہے اور کبھی ان پر قابو پانے کی انتھک کوشش کرتا ہے۔اور کمال یہ ہے کہ رلاتے رلاتے ہنسنے پر بھی مجبور کر دیتا ہے۔

کہاں تک جلائے گی اے برقِ سوزاں
ہر اک شاخ پر ہے ہمارا نشیمن

اک قیامت تھا شبِ غم کا گزرنا فرحتؔ
رات بھر پھوٹ کے رویا کئے چھالے دل کے

Scanned by CamScanner

اتنے کھائے ہیں دوستی کے فریب
اب تو جی دوستی سے ڈرتا ہے

میں غم دنیا کا مرہم ہوں مگر
میرے ہی غم کا کوئی مرہم نہیں

کب ترے در سے میں خالی آیا
غم ملا ، درد ملا ، کیا نہ ملا

زخم کو چھیڑنے والے تو بہت ملتے ہیں
زخم پر رکھے جو مرہم ، کوئی ایسا نہ ملا

فرحت قادری نے جس خوبصورتی اور ہنرمندی سے اپنی شاعری میں درد وغم اور کرب و گھٹن کو معنویت بخشی ہے اور جس طرح اپنے دل کے اندر غموں کے چراغ کو روشن کیا، وہ صرف اور صرف فرحت قادری کا حصہ ہے۔ غموں دکھوں اور کربناکیوں کو اپنی پلکوں پہ سجائے رکھنا بھی بڑے صبر و تحمل کا کام ہے اور ان کا اظہار حسین پیرائے میں کرنا فن کی عظمت کو بلندیوں پہ لے جانے کے مترادف ہے۔ فرحت قادری کی شاعری خاص طور پر غم والم کی شاعری نہ صرف دل و دماغ کو متاثر کرتی ہے بلکہ معنویت کی ایک پوری دنیا آباد کرتی ہے۔ غموں کا یہ احساس اور اس کا برملا اظہار ہی فرحت قادری کی شاعری کو عظیم سے عظیم تر بناتی ہے۔ ہمارے میر کے یہاں بھی غم والم کی شاعری ہے۔ کلیم عاجز کی شاعری بھی یاس و کرب کی پیداوار ہے۔ فرحت قادری کے دوسرے کئی ہم عصر شعراء کے یہاں بھی، درد وغم کا اظہار ملتا ہے لیکن ان تمام شعراء میں فرحت قادری کی آواز اور احساس بالکل الگ اور منفرد ہے۔ درد و کرب کا یہ احساس اور اظہار نہ صرف فرحت قادری کو عظیم بناتا ہے بلکہ اردو شاعری کی عظمت میں بھی اضافہ کرتا ہے۔

ایک غزل کے درج ذیل اشعار میں فرحت قادری نے جس طرح غم حیات کا مژدہ

Scanned by CamScanner

سنایا ہے۔ وہ یقینی طور پر اردو شاعری کے معیار اور وقار میں اضافہ کرتا ہے۔ یہ اشعار سن کر شاید میر بھی اپنا غم والم بھول جاتے ہیں:

چرکے غمِ حیات کے کھائے ہوئے ہیں ہم
اپنی صلیب خود ہی اٹھائے ہوئے ہیں ہم
جس درد کا نہیں ہے زمانے میں کوئی نام
وہ درد اپنے دل میں چھپائے ہوئے ہیں ہم

☆

حاصل نہیں ہے جس کو جہاں میں گدازِ غم
اس کی سمجھ میں خاک نہ آئے گا رازِ غم

ایسے خوبصورت اور معنویت سے بھرپور اشعار کے بعد فرحت قادری اگر کچھ بھی نہ لکھتے، تو بھی ایک نہ ایک دن فرحت قادری کی شعری عظمت کا اعتراف ضرور کیا جاتا اور ان کے ذکر کے بغیر اردو شاعری کی تاریخ نامکمل رہتی۔ فرحت قادری کی شاعری میں جو حسن بیان ہے، روانی، دلکشی اور نغمگی ہے وہ یقینی طور پر فرحت قادری کی شاعری کو ایک بلند مقام عطا کرتی ہے۔

اس امر سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے کہ فرحت قادری کی ابتدائی شاعری میں روایتی حسن پورے التزام کے ساتھ موجود ہے۔ لیکن فرحت قادری روایت کے زیادہ دنوں تک اسیر نہیں رہے اور بتدریج ان کی شاعری میں معیار اور وقار کا اضافہ ہوتا رہا اور وقت اور حالات کے تقاضوں کے ساتھ چلتے ہوئے اپنی شاعری کو جدید لب ولہجہ بھی عطا کیا۔ فرحت قادری نے جدید لب ولہجہ والی شاعری میں صرف جدیدیت کو ملحوظ خاطر نہیں رکھا بلکہ فکر وفن کی عظمت کو مجروح کئے بغیر جدید شاعری کا بہتر نمونہ پیش کر کے شعراء کی اس صف میں شامل ہو گئے جو جدیدیت کے پیداوار ضرور تھے، لیکن جدیدیت کو فن پر حاوی نہیں ہونے دیتے تھے۔ اور علامتوں، استعاروں اور تشبیہوں کو معنویت کے ساتھ ابھار کر اشعار کو ایک خاص کیفیت اور جذبہ سے دوچار کرتے تھے۔

فرحت قادری کی فنی اور فکری دسترس یکساں طور پر غزلوں، نظموں، رباعیوں اور

Scanned by CamScanner

قطعات پر۔ ہے اور وہ نت نئے تجربات اور مشاہدات کو شعری قالب میں ڈھال کر اپنی منفرد پہچان بنانے میں کامیاب رہے ہیں۔ مشہور شاعر علامہ جمیل مظہری فرحت قادری کی شاعرانہ عظمت کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''جہاں تک غزل میں فکر ونظر کی وسعت پیدا کرنے اور غم حیات اور غمِ دوراں کا رنگ بھرنے کی ضرورت کا سوال ہے۔ میں بھی فرحت صاحب کا ہمنوا ہوں۔ مگر اس کا قائل نہیں ہوں کہ غزل صرف انقلاب زندہ باد ہو کر رہ جائے۔ غزل کا مزاج نازک ہے۔ اس کی نزاکت، اس کی سادگی و پرکاری ہی اس کی جان ہے۔ فرحت صاحب کی غزلوں میں بحمد اللہ اس کا التزام کافی حد تک تک ہے، ان میں تازگی فکر بھی ہے، شدت احساس بھی، دلکشی بھی اور دلدوزی بھی۔''

فرحت قادری کی شاعری کا مطالعہ بتاتا ہے کہ فرحت قادری کی نظر عصری مسائل پر ہمیشہ گہری رہی ہے اور انہوں نے اپنے احساسات و جذبات کو اپنے گہرے مطالعہ و مشاہدہ کے ساتھ اشعار میں ڈھالا ہے۔ فرحت قادری کی حساس طبیعت ہمیشہ اپنے اردگرد کے سیاسی، سماجی، معاشرتی، تہذیبی، ثقافتی انقلابات سے متاثر ہوئی ہے۔ اور وہ ان تمام چھوٹی بڑی اکائیوں کو اپنی شاعری کا موضوع بناتے ہیں۔ دکھ، درد، ظلم وستم، استحصال، ناانصافی اور کرب و گھٹن ان کے محبوب موضوع رہے ہیں۔ اس لئے کہ ان آلام میں وہ خود کسی نہ کسی طور پر گرفتار رہے ہیں۔ اس طرح ان کا انفرادی کرب اجتماعی بن کر سامنے آتا ہے۔ داخلیت اور خارجیت کے شعری اظہار میں فرحت قادری کو خاصا عبور حاصل ہے۔ جو فنکاری اور صناعی کا نمونہ بن کر ہمارے سامنے شعری پیکر لئے نظر آتے ہیں۔ ''شیشے اور پتھر'' کی غزلوں کے چند اشعار دیکھئے۔

وقت کے پیچھے بھاگ رہا ہے، دھرتی پر آکاشوں میں
آج کا انساں اپنی دھن میں کھویا لگتا ہے

☆

وہی قتل عالم ہر سو وہی عالم تباہی
کہاں لے کے آگیا ہے میرا جرم بے گناہی

☆

رہتا ہے میرے دل میں میری جاں کی طرح
انساں جو کوئی ملتا ہے انساں کی طرح

فرحتؔ قادری کو انسانی اقدار، رشتوں اور روایتوں سے گہری وابستگی ہے۔ وہ حیات اور کائنات کو ایک خاص نقطۂ نظر سے دیکھتے اور برتتے ہیں۔ فن پر دسترس اور فکر کی بالیدگی اور موضوعات کے انتخاب نے فرحتؔ قادری کو ایک قادرالکلام شاعر کی انفرادیت اور اہمیت بخش دی ہے۔

فرحتؔ قادری نے اپنی دونوں طرح کی نظموں یعنی آزاد اور پابند نظموں میں بھی اپنے فلسفۂ حیات و کائنات کو ایک خاص فکر و معنی بخشی ہے۔ اور مسائل حیات کو اپنا خاص موضوع بنایا ہے۔ داخلی پنہائیوں کے نشیب و فراز سے زیادہ معاشرے کے عام موضوعات کے گردان کی کئی نظمیں معرکتہ الآرا اور سنگ میل کی حیثیت اختیار کرگئی ہیں۔ 'آدمی اور مشین، بھوک، حیات مضمر، تریاق وغیرہ نظمیں فکری اور فنی دونوں اعتبار سے قابلِ ذکر ہیں۔ جنون آگہی، عصائے رہبر، اور اجنبی راہیں وغیرہ جیسی کئی دیگر پابند یا معریٰ نظموں میں فرحتؔ قادری کا فلسفیانہ لب و لہجہ خاص طور پر توجہ مبذول کراتا ہے۔ آزاد نظموں میں فرحتؔ قادری کی داخلی کیفیات زیادہ واضح اور نمایاں ہیں اور جدید محسوسات کا سمندر موجزن ہے۔ ریگ رواں، دائرہ، شکست فصیل کے بعد، رشتۂ احساس اور کون جانے' وغیرہ جیسی نظمیں فنکار کی شخصیت اور فن دونوں کو ایک باوقار انداز سے متعارف کرائی ہیں۔ اور تہہ در تہہ معنویت کی دلفریبی اور دلکشی سامنے آتی ہے۔

۱۹۷۵ء میں فرحتؔ قادری کا پہلا شعری مجموعہ ''کائنات غم'' منظر عام پر آیا، جس میں وہ ساری خصوصیات موجود تھیں، جو کسی بڑے اور معتبر شاعر کے مجموعہ کلام میں ہونا چاہئے مجموعہ کے نام ''کائنات غم'' کے اعتبار سے پورے مجموعہ میں غم ہی غم نمایاں ہیں۔ لیکن ان غموں کے اظہار میں فکری اور فنی پہلو بڑی ندرت کے ساتھ موجود ہیں۔ حالات نے غالبًا

Scanned by CamScanner

فرحت قادری کے حصے میں کچھ زیادہ ہی غم دیئے ہیں، جنھیں وہ شعوری اور لاشعوری طور پر شعری پیکر میں ڈھالتے ہیں۔ جو فکر و احساس کے قابل قدر نمونے قرار دیئے جا سکتے ہیں۔ چند اشعار بے اختیار توجہ مبذول کراتے ہیں ؎

ابھی کسی سے مسرت کی بھیک کیا مانگوں
ابھی تو اشکوں کے موتی ہیں میرے دامن میں

☆

فقط انھیں کے لئے بجلیاں تڑپتی ہیں
برائے نام جو تنکے ہیں کچھ نشیمن میں

☆

ڈھلتے ڈھلتے ڈھل گیا سورج
آج بھی کچھ پیغام نہ آیا

☆

جن کے شعروں پہ جھومتے ہیں آپ
ان کی حالت پہ بھی نظر کی ہے؟

یہ اشعار اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ فرحت قادری نے زندگی کی تلخیوں اور کڑواہٹوں کو گھونٹ گھونٹ پیا ہے اور زندگی کی محرومیوں، نا امیدیوں، یاس، درد و کرب اور فریب کو بہت قریب سے دیکھا ہے اور جھیلا ہے۔ ''کائنات غم'' میں ''ایک جائزہ'' کے تحت عطا کاکوی نے فرحت قادری کی شاعری کا جائزہ لیتے ہوئے لکھا ہے:

''اردو شاعری پر عام اعتراض یہ ہے اور یہ اعتراض بجا بھی ہے کہ شاعر کی زبان اور اس کے دلی جذبات میں ہم آہنگی نہیں پائی جاتی۔ حالانکہ شاعری وہی ہے جو دلی جذبات کا آئینہ دار ہے۔ وہ وہی کہتے ہیں جو محسوس کرتے ہیں۔''

فرحت قادری کی یہ خصوصیات ان کی پوری شاعری میں بڑے خوبصورت انداز میں

ملتی ہیں۔ ذات کا کرب، محرومی، یاس کے ساتھ ساتھ حیات و کائنات کے اسرار و رموز، سماجی، سیاسی مسائل اور معاشی بحران کو بھی فرحت قادری نے اپنے منفرد لب و لہجہ میں پیش کیا ہے۔ جس کا ثبوت فرحت قادری کا دوسرا شعری مجموعہ ''شیشے اور پتھر'' ہے، جس کا مطالعہ بتاتا ہے کہ فرحت قادری کو ہمیشہ اس بات کا احساس رہا کہ شاعری تصوراتی نہیں بلکہ حقیقی اظہار کا ذریعہ ہے اور یہ اظہار ذات کا کرب، تنہائی، عدم تحفظ، خوف اور کشمکش کا بھی ہے اور سماجی انتشار، سیاسی بازی گری اور معاشی بدحالی کا بھی۔ اردو کے کچھ شاعر اپنی ذات تک محدود رہ کر شاعری کرتے ہیں اور کچھ ایسے شاعر ہیں جو اپنی ذات کے ساتھ ساتھ دوسروں کے درد و کرب کو بھی جھانکنے کی کوشش کرتے ہیں۔ فرحت قادری نے اپنی شاعری کو اپنی ذات کی تڑپ اور گھٹن تک محدود نہیں رکھا بلکہ عصر حاضر کے مسائل اور حقائق پر بھی نظر ڈالی ہے اور اپنے محسوسات کو اپنے شعروں میں گہری معنویت کے ساتھ پیش کیا ہے۔

غمِ حیات کے جلوے دکھا رہی ہے غزل
نئی ڈگر پہ زمانے کو لا رہی ہے غزل

حیات و کائنات کے جلوے دکھانے والی فرحت قادری کی غزلیں عصر حاضر کی تمام تر کیفیات و واقعات کا اظہار ہیں جس نے فکری اور فنی لوازمات کو برتتے ہوئے اپنے مطالعے کی گہرائی اور مشاہدے کی گیرائی کا زبردست ثبوت فراہم کیا ہے۔ روایت سے جڑی ہوئی جدید لب و لہجہ کی غزلوں میں فرحت قادری نے فکر و احساس کے نئے نئے گل بوٹے کھلائے ہیں۔ فرحت قادری نے علامتوں، استعاروں اور تشبیہات کا بھی سہارا لیا ہے جو ابہام یا ترسیل کا مسئلہ پیدا کرنے کی بجائے اشعار کو حسن و معنی بخشتے ہیں۔

فرحت قادری ۱۹۴۷ء سے قبل سے شاعری کر رہے ہیں لیکن ان کے اشعار آج بھی نئے اور تازہ لگتے ہیں۔ اس لئے کہ فرحت قادری نے وقت اور حالات کے تقاضے کو پورا کرنے کے ساتھ ساتھ صرف روایت کے پابند رہنے کی بجائے جدید فکر و معنی کو پیش کیا۔ یہی وجہ ہے کہ فرحت قادری کی شاعری میں احساسات و جذبات اور فکر و آہنگ میں ندرت، تازگی، شگفتگی اور شعلگی کی وہی کیفیات موجود ہیں جو بالکل تازہ دم شعراء کے یہاں بدرجۂ اتم ملتی ہیں۔ فرحت قادری نے اپنی غزلوں میں جہاں حسن و عشق کی کیفیات بیان کی

Scanned by CamScanner

ہیں وہیں انہوں نے الفاظ کے پتھر بھی برسائے ہیں ،بقول جمیل مظہری : ''سماج کے ستونوں پر ،نئی تہذیب کی شاخوں پر ،سیاست کے ایوانوں پر اور سرمایہ داروں کے سروں پر اس سلسلے میں چند اشعار قابلِ توجہ ہیں۔ دیکھئے۔

یہاں کسی سے کوئی بات تک نہیں کرتا
نظر تو آتے ہیں سب لوگ آدمی کی طرح

☆

پڑتی نہیں کسی کی اچٹتی نگاہ بھی
میں شہر میں ہوں گمشدہ سامان کی طرح

☆

اپنا ہی گھر ہے ، اپنے ہی سب لوگ ہیں مگر
ہر شخص مجھ سے ملتا ہے انجان کی طرح

☆

بند کرلیا کمرہ اور روک لیں سانسیں
اپنے آپ پر ہم نے کتنے ظلم توڑے ہیں

☆

بڑھ رہا ہے جس قدر انسان پر بارِ حیات
گر جاتا ہے اسی نسبت سے معیارِ حیات

یہ تمام اشعار ایسے ہیں جو فکری اور فنی اعتبار سے منفرد ہونے کے ساتھ ساتھ معنویت کے کئی دروازے کھولتے ہیں۔ جدید اردو غزل میں فرحت قادری کا نام اہمیت کا حامل ہے ،انھوں نے اپنی شاعری سے اردو غزل کو جو وسعت اور وقار بخشا ہے اور فکر و معنی کے ساتھ ساتھ اردو غزل میں غم و الم کو جس انداز سے معنویت بخشی ہے اس سے اردو غزل نہ صرف مالا مال ہوئی ہے بلکہ اس کے معیار اور عظمت میں بھی اضافہ ہوا ہے۔ ان تمام خصوصیات کو دیکھتے ہوئے یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ فرحت قادری دور جدید کے میر ہیں۔ ☆☆☆

Scanned by CamScanner

علقمہ شبلی

نام : ابوعلقمہ محمد شبلی نعمانی

تخلص : شبلؔی

ولادت : ۱۱؍نومبر ۱۹۲۸ء (غیاث چک، پٹنہ)

نام والد : مولوی عبدالجبار

تعلیم : ایم۔اے (فارسی) ۱۹۶۳ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسیٹی سے

شعری تصنیفات:

۱۔حرف وصوت (پہلا شعری مجموعہ) ۱۹۷۵ء

۲۔بے چہرہ لمحے (دوسرا شعری مجموعہ) ۱۹۷۵ء

۳۔خواب خواب زندگی (غزلیں) ۱۹۹۰ء

۴۔زادسفر (حمدیہ ونعتیہ رباعیات) ۱۹۹۰ء

نوٹ: ادب اطفال پر کئی کتابیں بھی شائع ہوئی ہیں۔

Scanned by CamScanner

علقمہ شبلی: بدلتے وقت کا شاعر

آزادیٔ ہند کے بعد اردو شاعری کے افق پر جو نام اپنی شعلہ بیانی، تازگی احساس ندرت خیال اور منفرد اظہار و بیان کی جملہ خصوصیات کے ساتھ ابھرے ہیں ان میں علقمہ شبلی کا نام بڑا نمایاں اور اہمیت کا حامل ہے۔

۱۹۴۸ء سے علقمہ شبلی نے شعر و سخن کی وادی میں قدم رکھا۔ یہ دور انتشار، عدم استحکام اور تبدیلیٔ وقت اور حالات کا تھا۔ ۱۹۷۵ء میں شائع ہونے والے اپنے پہلے شعری مجموعہ ''بے چہرہ لمحے'' کے پیش گفتار میں علقمہ شبلی رقم طراز ہیں:

> ''۱۹۴۸ء میں جب میں نے پہلی غزل کہی، زندگی کی قدریں بدل رہی تھیں، ملک کی سیاسی تقسیم اور پھر فرقہ وارانہ فسادات نے ایقان و اعتماد کی بنیاد ہلا دی تھی قومی اور بین الاقوامی سطح پر ایسی تبدیلیاں رونما ہو رہی تھیں جو روح فرسا اور جاں گسل تھیں۔ اس بے یقینی، بے سمتی اور انتشار کی فضا میں زندگی درد مستقل بن گئی تھی۔''

علقمہ شبلی ایک حساس دل کے مالک ہیں۔ آزادیٔ ہند اور تقسیم ملک کے درمیان جو حادثات اور واقعات رونما ہوئے اور پھر تبدیلیٔ حالات سے جو غیر یقینی صورت حال سامنے آئی، فرقہ واریت کی جنونی کیفیات پیدا ہوئیں، حیوانیت کی آگ میں انسانیت کو خاکستر ہونا پڑا اور اعلیٰ مینار یں زمیں بوس ہو گئیں ان سب کو دیکھ کر ایک حساس دل انسان کو اگر قوت گویائی نصیب نہ ہو تو وہ گھٹ گھٹ کر مر جائے اور گھٹ گھٹ کر مر جانے کے مرحلہ سے علقمہ

Scanned by CamScanner

شبلی کو ان کی شعر گوئی کی خداداد صلاحیتوں نے بچالیا۔لیکن تلخیٔ وقت نے ان کے دل ودماغ پر جو اثرات مرتسم کئے ان کا اظہار انہوں نے بڑی فنکارانہ صلاحیتوں اور شدت احساس و جذبات کے ساتھ کیا ہے:

آج کے ٹوٹتے لمحوں کی دھڑکن ہے جس میں
عصر نو کا وہ سلگتا ہوا لہجہ ہوں میں

ٹوٹتے لمحوں اور بکھرتی قدروں کو بہت قریب سے دیکھ کر علقمہ شبلی کے اندر کا شاعر کبھی تیز لہجے میں اور کبھی دھیمے سروں میں احتجاج کرتا نظر آتا ہے۔گاؤں سے نکل کر شہر کے ہنگاموں میں پہنچنے والے علقمہ شبلی کو بھیڑ میں بھی تنہائی، روشنی میں بھی تیرگی اور معصوم چہرے کے پیچھے چھپی خوفنا کی نے یقینی اور غیر یقینی حالات کی ستم ظریفی سے دوچار کیا۔زندگی کی تلخ و تند حقیقتوں سے وہ کبھی آنکھیں چار کرنے میں گھبراتے ہیں اور کبھی ان احساسات کو جھٹک کر ان سے نبرد آزما ہو جاتے ہیں۔

شہر میں شبلی کو آدمی تو ملتا ہے لیکن انسانیت نہیں، رشتے تو ملتے ہیں، لیکن قدریں نہیں اور احساسات و جذبات کے اٹھتے ہوئے دھوئیں برف کی آگ ثابت ہوتے ہیں۔سیاسی، سماجی اور معاشرتی حالات، گاؤں کے مقابلے شہر میں بالکل جدا جدا نظر آتے ہیں:

یوں تو بن کر خدا لوگ ملتے رہے
کاش ملتا کوئی آدمی کی طرح

☆

راستے ویران ، چہرے فق ، لبوں پر خامشی
دوستو! یہ شہر بھی اب مجھ کو اپنا گھر لگے

☆

زخم تنہائی کا شبلی تھا نہ کچھ کم جاں گداز
اور اس پر یہ ہوا کہ پے بہ پے نشتر لگے

Scanned by CamScanner

کون اب کسی کو پکارے، کس سے باتیں ہوں یہاں
شہر میں ہیں لوگ بے چہرہ نقابوں کی طرح

☆

اب ہے چہروں پر نقاب مصلحت
کوئی چہرہ دل کا آئینہ نہیں

تبدیلیٔ وقت اور حالات کی ستم ظریفیوں نے جو کچوکے لگائے، جو زخم دیئے جو اداسیاں اور غم دیئے ان تمام تر کیفیات کے علقمہ شبلی عادی ہوتے گئے۔ کبھی حالات سے برگشتہ اور کبھی حالات سے سمجھوتہ۔ اسی تذبذب میں زندگی دھوپ چھاؤں کی مانند گذرتی رہی اور آخر کار انہیں اس تند احساس کو گلے لگانا ہی پڑا۔

آئے گا اسی طور تو جینے کا قرینہ
ہر گام پہ گرتوں کو سنبھالا نہیں کرتے

☆

ہر بارِ الم سر پہ اٹھانا ہے ہمیں کو
اب درد یہاں دوست بھی بانٹا نہیں کرتے

☆

ہے خواب خواب زندگی، دھواں دھواں ہے روشنی
نظر نظر بجھی ہوئی ، قدم قدم تھکا ہوا

☆

زندگی کی تلخ حقیقتوں کو اتنے خوبصورت اور معنویت سے بھرپور اشعار کے ذریعے سمجھنے اور سمجھانے والے شاعر علقمہ شبلی کے متعلق مختلف نقادوں نے مختلف خیالات کا اظہار کیا ہے۔ مثلاً ڈاکٹر محمد حسن کا خیال ہے کہ:

''علقمہ شبلی کی شاعری میں خلوص کی روشنی ہے اور یہ بات تخلیقی

Scanned by CamScanner

شہ پارے کی سب سے اہم خصوصیت کہی جا سکتی ہے۔''

ڈاکٹر محمد حسن کو علقمہ شبلی کی شاعری میں خلوص کی روشنی جگمگاتی نظر آتی ہے تو دوسری طرف معروف جدیدیت پسند نقاد شمس الرحمٰن فاروقی کو علقمہ شبلی کی شاعری میں الفاظ کے خوبصورت استعمال اور اسلامی اساطیر کی خصوصیات کی کارفرمائی ملتی ہے۔

ان دو مختلف مکتبہ فکر کے نقادوں کے ساتھ ساتھ ایک بڑے فنکار مظہر امام کو علقمہ شبلی کے خیالات میں وسعت اور طرز اظہار میں تنوع کے ساتھ ساتھ جو خصوصیات نظر آتی ہیں ان کا اظہار وہ اس طرح کرتے ہیں:

''ان کے خیالات میں وسعت اور طرز اظہار میں تنوع ہے۔
ان کے لہجے میں امید اور رجائیت ہے۔ ان کی آواز میں نرمی اور شائستگی ہے جو عصری مسائل اور زندگی کی تلخ حقیقتوں سے آنکھیں ملانے کے باوجود قائم ہے۔ ان کی شاعری ان کے تجربوں کی صلابت اور قوت شعر گوئی کی آئینہ دار ہے۔''

ان تین نامور شخصیات کی آراء کے بعد علقمہ شبلی کے دو اشعار جو بے اختیار ذہن کے پردے پر ابھرتے ہیں ملاحظہ فرمائیں:

سر اپنا جھکاؤ گے کہاں؟ یہ بھی تو سوچو
یہ دور ہے بے سمتی کا، قبلہ نہ ملے گا!

☆

چھا جائے نہ احساس پہ ظلمت شب غم کی
یارو! دل سوزاں کی نہ قندیل بجھاؤ!

علقمہ شبلی نے روایت کی جہاں پاسداری کی ہے، وہیں جدیدیت کے مثبت تقاضوں سے بھی عہدہ برآ ہوئے ہیں۔ زندگی کی حقیقتوں کو بھی پوری معنویت، فکری آگہی اور فنی خوبیوں کے ساتھ پیش کرنے پر علقمہ شبلی کو عبور حاصل ہے اور یہ انداز بیان یقینی طور پر علقمہ شبلی کو اپنے ہم عصروں میں منفرد بناتا ہے۔ علقمہ شبلی وقت کے نباض ہیں اور حالات کے تیز

Scanned by CamScanner

دھارے میں بھی اپنی پہچان بنائے رکھنے میں بے حد کامیاب ہیں۔ عاقمہ شبلی غزلوں کے ساتھ ساتھ اپنی نظموں میں بھی اپنے طرز اظہار اور فکر وفن کی بلندی کی بنا پر اپنی انفرادیت پوری طرح برقرار رکھتے ہیں۔ زندگی کے مختلف تجربات وحوادث نے انہیں جو درد وداغ اور جستجو وآرزو ودیعت کی ہیں، ان کا متنوع اظہار انہیں آفاقیت بخشتا ہے۔ عاقمہ شبلی کی شاعری یقینی طور پر اردو شاعری میں اضافہ کی حیثیت رکھتی ہے جس سے آنے والی نسلیں استفادہ کرتی رہیں گی۔

Scanned by CamScanner

رمزؔ عظیم آبادی

نام : رضا علی خاں

تخلص : رمزؔ

ولادت : ۱۹۱۶ء (پٹنہ)

وفات : ۱۵ر جنوری ۱۹۹۷ء

نام والد : قدرت اللہ خاں

شعری تصنیفات :

۱۔ نغمۂ سنگ (مجموعۂ کلام) ۱۹۸۸ء

۲۔ شاخ زیتون (مجموعۂ کلام) ۱۹۹۸ء

rekhta

Scanned by CamScanner

رمزؔ عظیم آبادی کی شاعری

رمزؔ عظیم آبادی کی شاعری کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ ان کی شاعری میں فکر وفن کا جو التزام ہے اور اپنے منفرد اسلوب کا جو سحر انھوں نے جگایا ہے وہ ان کے دوسرے ہم عصر شعراء کے یہاں کم ہی دیکھنے کو ملتا ہے۔ ویسے یہ ایک المناک حقیقت ہے کہ رمزؔ کو ان کی شاعری کے حوالے سے سمجھنے کی کوشش نہیں کی گئی، بلکہ ان کی معاشی بدحالی اور معاش کے لئے ان کے رکشہ چلانے پر نظر کی گئی۔ جس کے نتیجے میں رمزؔ کو انصاف نہیں ملا، بلکہ ان کے ساتھ بددیانتی کی گئی۔ اس عمل سے بڑے موثر، معیاری، باوقار اور فکر و معنویت سے بھرپور شاعری کرنے والے فن کار کو اردو کے شعری ادب میں وہ مقام نہیں مل سکا، جس کے وہ مستحق تھے۔ رمزؔ نے غربت، مفلسی، استحصال، ناانصافی اور نفرت کو بہت قریب سے دیکھا اور شدت کے ساتھ محسوس کیا تھا۔ اس لئے ان کی شاعری میں یہ عناصر بھرپور معنویت کے ساتھ موجود ہیں۔ ایسے احساسات و جذبات کے اظہار کے لئے جس عمیق مشاہدہ اور تجربہ کی ضرورت ہوتی ہے وہ پوری طرح ان کے اندر موجود تھا۔ اگر یہ کہا جائے تو شاید غلط نہ ہوگا کہ یہی وہ بصیرت اور بصارت کی کارفرمائی تھی اور مسائل حیات کے داخلی و خارجی احساسات تھے، جس نے اس کم تعلیم یافتہ شخص کو قوت گویائی دے دی اور اسی قوت کے سہارے اس نے مفلسی، غربت،، بے بسی، بے کسی اور بے حسی کے افکار و خیالات کو خوبصورت لفظوں میں ڈھال کر کبھی غزل اور کبھی نظم کی تخلیق کی۔ تخیلات اور تصوّرات کے بجائے زندگی کی حقیقت پر انھوں نے زیادہ توجہ مبذول کی، یہی وجہ ہے کہ وہ اصناف سخن کی جس صنف کو بھی اپنے اظہار خیال کے لئے منتخب کرتے، ان میں وہ بے حد کامیاب نظر آتے۔ غزلوں اور نظموں کے ساتھ ساتھ رمزؔ نے رباعیات، قطعات، قصائد، ہجویات اور نعتیہ شاعری میں بھی اپنے فن کا کمال دکھایا ہے۔ ''نغمۂ سنگ'' اور شاخِ زیتون'' جیسے دو اہم شعری مجموعوں کے علاوہ ان کی بہت ساری معیاری

Scanned by CamScanner

تخلیقات بکھری پڑی ہیں ۔ رمزؔ نے سہل پسندی کے دور میں بھی اپنی فکری وفنی بصیرتوں کا بھرپور مظاہرہ کرا اپنا لوہا منوالیا۔ رمزؔ کی شاعری میں جہاں روایت کی پاسداری ہے، وہیں وہ جدیدیت کے تقاضے کو بھی پورا کرتی ہے۔ اپنے اردگرد کے سیاسی، سماجی، اور معاشرتی ماحول اور حالات کا جس خوبصورتی سے انھوں نے اپنی شاعری میں اظہار کیا ہے، وہ نہ صرف زندگی سے بے حد قریب بلکہ فکری وفنی اعتبار سے آفاقیت کی حامل ہیں ۔

رنگوں کا امتیاز ، غزل کا ہنر نہ دے
میری طرح کسی کو عذاب نظر نہ دے

☆

اے رمزؔ لگ رہے ہیں ستارے بجھے بجھے
سورج کے شہر میں بھی کوئی حادثہ ہوا

☆

تمہارے یار بھی اصحاب ابن مریم ہیں
خلوص جھیل چکے ہو ، منافقت دیکھو

☆

کون ہے وہ جس کی خاطر تم نے رسوائی خریدی
نیک نامی کے عوض یہ جنس رسوائی خریدی
کتنے گونگوں کو زبان دے کر بنایا اپنا دشمن
تم نے بھی مغلوب ہوکر یہ مسیحائی خریدی

☆

کبھی وہ میری گزرگاہ بن نہیں سکتی
زمانہ روند کے چلتا ہے جن زمینوں کو
بدن کی آنچ جو محسوس کر نہیں سکتے
وہ سرد لوگ نہ سمجھیں گے رمزؔ کے اشعار

ایسے خوبصورت اور بامعنیٰ اشعار صرف غزلوں ہی میں نہیں، بلکہ رمزؔ کی کئی ایسی نظمیں

Scanned by CamScanner

مثلاً ''تاج محل''، ''روشنی کی زنجیر''، ''زندگی''، ''بہاروں کی دنیا''، ''صبح تمنا''، ''تلخ صداقت''، ''ممتا''، ''اجالا امر ہے'' اور ''نقش دوام'' وغیرہ ہیں جن میں متنوع موضوعات، افکار و خیالات کی آفاقیت، اسلوب کی انفرادیت اور احساسات و جذبات کی شدت کو پورے طور پر ابھار کر قاری کے دل و دماغ کو جھنجھوڑ کر رکھ دیتا ہے۔ اپنی نظموں اور غزلوں میں رمز نے علامتوں، استعاروں اور تشبیہوں کا فنی تقاضوں کے ساتھ استعمال کیا ہے اور فکری و فنی اعتبار سے کامیاب نظر آتے ہیں۔

رمز نے منظر عظیم آبادی، ثاقب عظیم آبادی اور پرویز شاہدی جیسے قابل ذکر شعراء کے سامنے زانوئے ادب تہہ کیا اور اگر رمز کی شاعری کا صحیح تجزیہ کیا جائے تو یہ اندازہ ہوگا کہ فکری اور فنی لحاظ سے وہ اپنے تینوں اساتذہ کرام شعراء سے آگے نکل جانے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ ایسا باکمال اور باوقار شاعر جس کا شعور اور فکر زماں و مکاں سے بہت آگے نکل گیا، ایسے شاعر کے ساتھ ناقدوں کی ناقدری پر جس حد تک افسوس کیا جائے، کم ہے۔ ان کی شاعری کی جو آفاقیت ہے، جو معنویت ہے، جو ندرت و تازگی ہے اور جو شدت و وحدت ہے، وہ یقینی طور پر ایک دن رمز کو انصاف دلائے گی، اس کا مجھے یقین ہے۔ اس امر کا احساس خود رمز کو بھی تھا، وہ خود کہتے ہیں۔

میرا شعور زمان و مکاں سے آگے ہے
تم اس صدی کے تناظر میں مجھ کو مت دیکھو

رمز جیسا باکمال شاعر کم پیدا ہوتا ہے جو اپنی فقیری میں مست رہتا اور اپنے فکر و فن سے دوسروں کی شہرت کے چراغ روشن کرتا ہے۔

کتنے گمناموں کی شہرت کا وسیلہ بن گیا
رمز میں ایسا فقیر عظمت بخشندہ ہوں

۱۹۱۶ء میں آنکھیں کھولنے والا یہ شاعر ۱۵ر جنوری ۱۹۹۷ء کو ابدی نیند سو گیا اور اپنے پیچھے اتنا شعری سرمایہ چھوڑ گیا ہے جو اسے شعری ادب میں ایک اہم مقام و مرتبہ دلانے کے لئے کافی ہے۔!

علیم اللہ حالیؔ

نام : سید علیم اللہ
تخلص : حالیؔ
ولادت : ۱۹۴۱ء بھاگلپور
نام والد : سید احمد
تعلیم : ایم۔اے، پی ایچ۔ڈی (پٹنہ یونیورسیٹی)
مشغلہ : درس و تدریس
شعری تصنیفات:

۱۔سفر جلتے دنوں کا (شعری مجموعہ)
۲۔نخلِ جنوں (شعری مجموعہ)
۳۔لفظ، آواز، صورت گری (شعری مجموعہ)

rekhta

Scanned by CamScanner

علیم اللہ حالی: منفرد لب ولہجہ کا شاعر

علیم اللہ حالؔی کے افکار و اظہار نے ایک مخصوص اور منفرد راہ متعین کر لی ہے۔ ان کی شاعری کا سفر جلتے دنوں سے شروع ہو کر نخل جنوں سے گزرتا ہوا 'لفظ' آواز اور صورت گری کی آفاقیت تک پہنچتا ہے۔

عصری اعتبار سے حالؔی کی شاعری ترقی پسند تحریک کے زوال اور جدیدیت کے ابتدائی دور سے منسوب کی جاسکتی ہے۔ ۶۳۔۱۹۶۲ء کے آس پاس جب ذہنی وفکری لحاظ سے ہمارے ادباء وشعراء انحراف اور اعتراف کے تلاطم سے گزر رہے تھے، اس وقت ترقی پسند تحریک کے وابستگان نے جس نقطۂ نظر سے اجتماعی زندگی کو دیکھا اور محسوس کیا تھا، معاشرتی حالات اور واقعات کی جو تعبیر وتشریح کی تھی اور ان کے سامنے ایک بدلا بدلا سا منظرنامہ تھا، برصغیر کی آزادی، فسادات، زمیندارانہ نظام کی شکست و ریخت، دیہی ماحول میں تبدیلی، کاشت کے مقابلے صنعتی نظام کا فروغ، اجتماعی زندگی کے ٹوٹنے بکھرنے اور انفرادی مسائل کے ابھرنے وغیرہ جیسے بے شمار چھوٹے بڑے عوامل سے عصری تبدیلیاں ظہور پذیر ہونے لگی تھیں۔ ساتھ ہی ساتھ افکار و اظہار کی سطح پر بھی جو تغیرات رونما ہونے لگے تھے، ان کے اثرات حالؔی نے براہ راست یا بالواسطہ قبول کیا۔ دراصل دیکھا جائے تو حالؔی نے اس عبوری اور انتشاری دور میں شعور کی آنکھیں کھولیں اور اپنے خوبصورت اظہار اور نئے افکار کو اپنی شاعری میں پیش کرنے کا آغاز کیا۔

علیم اللہ حالؔی اپنی غیر معمولی فکر ونظر اور تخلیقی ندرت کی بنا پر بہت جلد اپنی ایک پہچان بنانے میں کامیاب رہے۔ گرچہ عبوری دور کے جو فائدے اور نقصانات ہوتے ہیں، وہ بھی حالؔی کی ادبی و تخلیقی شخصیت کی تشکیل میں اثر انداز ہوئے۔ عبوری دور سے تعلق رکھنے والے

Scanned by CamScanner

فنکار کے لئے اپنی راہ متعین کرنے میں کئی طرح کی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ان کے سامنے فکرونظر کے بنے بنائے راستے اگر ایک طرف مسدود ہوجاتے ہیں تو دوسری جانب نئے راستے کی تعمیر ایک اجتہادی بات ہوتی ہے۔ایسے حالات میں نبرد آزما ہونے کے لئے اور اپنی ایک الگ پہچان بنانے کے لئے کسی بھی فنکار کا تخلیقی اعتبار سے زیادہ توانا اور با صلاحیت ہونا ضروری ہوتا ہے،روایت کے ٹوٹنے اور فکری سطح پر خلاء پیدا ہوجانے کے سبب فنکار کو اپنی بقا کے لئے سخت جدوجہد کرنی پڑتی ہے۔علیم اللہ حالی نے ''سفر جلتے دنوں کا'' سے لے کر ''لفظ،آواز اور صورت گری'' تک ان دشوار گزار راستوں پر چل کر نہ صرف اس نئے ماحول میں خود کو زندہ رکھا، بلکہ اپنے افکار و اظہار کی وسعت و معنویت کے لحاظ سے اپنے دور کے ایک نمائندہ فنکار کے طور پر اپنی حیثیت تسلیم کرانے میں کامیاب رہے۔

علیم اللہ حالی نے یوں تو مختلف اصناف سخن پر طبع آزمائی کی ہے،لیکن ان کا خاص میدان غزل و نظم ہے۔ان کی غزلوں اور نظموں کے مطالعہ کے بعد یہ فیصلہ کرنا مشکل ہوجاتا ہے کہ ان دونوں اصناف میں سے کس صنف میں فکری و فنی سطح پر وہ بلند ہیں،اس کی وجہ یہ ہے کہ حالی کا نہ صرف مطالعہ و مشاہدہ کافی گہرا ہے، بلکہ فکری و فنی اعتبار سے بھی وہ کافی بلندی پر نظر آتے ہیں۔اس ضمن میں حالی ایک سوال کے جواب میں فرماتے ہیں:

> ''یہ فیصلہ تو قارئین کریں گے کہ میں نے کس صنف ادب میں اپنی بہتر تخلیقیت کا اظہار کیا ہے۔ویسے تخلیقی عمل کے دوران میں نے اکثر یہ محسوس کیا ہے کہ غزل ہماری سابقہ تہذیبی روایات سے گہرے طور پر وابستہ ہے۔ اس میں غیر محسوس طور پر بھی ان موضوعات کی پیش کش ہوجاتی ہے جن کا تعلق ہماری روایات سے ہے۔غزل کو ایک مخصوص مشرقی کلچر کی روشنی میں دیکھنا چاہئے اور اسی طرح اس کے جوہر کھل کر سامنے آسکتے ہیں..........
> غزل کے اشعار میں نظم کے مقابلہ میں اثر خیزی کی رفتار حد درجہ تیز ہوتی ہے۔نظم ذرا ٹھہر کر تھوڑے وقفے کے بعد تاثرات کی دنیا تک پہنچاتی ہے۔ نظم و غزل کے تاثرات کے عرفان کا مسئلہ قاری کے ذوق و رجحان سے جڑا ہوا ہے۔بہر کیف میں اپنے بارے میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ میں نظم لکھتے وقت

Scanned by CamScanner

زیادہ دلچسپی، انہماک اور دریافت کی منزل میں رہتا ہوں۔''

(ماہنامہ 'سہیل' جلد:۴۶، شمارہ:۴ صفحہ ۱۴۔۱۳)

علیم اللہ حالی کے اس اعتراف کے بعد ان کی غزلوں کے درج ذیل چند اشعار کا مطالعہ انہیں ایک منفرد اور خوش گو غزل گو ثابت کرنے کے لئے کافی ہے۔

سر شاخ تعلق جل چکا ہے
مگر نخل جنوں شاداب پھر بھی

☆

تبسّم بھی لبوں پر ، چشم نم بھی
کہ رخصت کے ہیں کچھ آداب پھر بھی

☆

گزرا ہر ایک شخص مجھے دیکھتا ہوا
گویا میں آدمی نہ ہوا ، آئینہ ہوا

☆

کوئی پتھر کا نشاں رکھ کے جدا ہوں تم سے
جانے یہ پیڑ کس آندھی میں اکھڑ جائے گا

☆

تیز دھوپ میں حالؔی سایہ سایہ اس کی یاد
زندگی گزرتی ہے جس کے نام پر تنہا

ان اشعار کو دیکھنے کے بعد علیم اللہ حالؔی کی بے پناہ تخلیقی صلاحیتوں کا احساس ہونے کے ساتھ ساتھ اس امر کا بھی اندازہ بخوبی ہوتا ہے کہ حالؔی عصری شعور، عصری احساس اور عصری مسائل کی آگہی کو فن کی بھٹی میں تپا کر بڑے ہی موثر، معتبر اور فنکارانہ انداز میں پیش کرنے کے ہنر سے بخوبی واقف ہیں۔ حالؔی نے ماضی کی اعلیٰ قدروں کے زوال اور عصر حاضر کی کشمکش، بے چینیوں اور بے راہ رویوں کو موضوع سخن بنایا ہے۔ جدید لب ولہجہ کے اس شاعر کے یہاں جدید موضوعات، مثلاً تنہائی، ویرانی اور افسردگی پوری شدت سے ابھر کر سامنے

Scanned by CamScanner

آئے ہیں اور یہ احساس کرانے میں کامیاب ہیں کہ بظاہر وہ اپنی ذات کے کرب کا اظہار کرر ہے ہیں لیکن یہ ذاتی کرب بھی ایک وسیع دنیا آباد کرتا نظر آتا ہے۔ درج بالا تمام اشعار ایسے ہیں جو حالؔی کے تغزل کو کافی بلندی پر لے جاتے ہیں، جس سے جدید غزل کا ایک بے حد معیاری اور حسین منظر نامہ تیار ہوتا ہے۔

حالؔی کی شاعری کے سلسلے میں کچھ اسی طرح کی رائے کا اظہار وزیر آغا کرتے ہیں، وہ فرماتے ہیں:

''علیم اللہ حالؔی کی شاعری میں ذات کا الیہ کچھ اس طور پر ابھر آیا ہے کہ روایت کی منہ زوری از حد مدھم پڑ گئی ہے۔ ان کے یہاں کرب کا احساس کافی گہرا ہے اور ان کے اشعار میں زندگی کی لا حاصلی اور بے معنویت کا شعور صاف جھلکنے لگا ہے۔''

غزلوں کے ساتھ ساتھ حالؔی نے مختلف ہیئتوں میں متعدد ایسی منظومات پیش کی ہیں، جو نئی اردو نظم نگاری کے عصری خدو خال متعین کرتی ہیں۔ نئی اردو نظم نگاری کی تاریخ میں حالؔی کی نظموں کے ذکر کے بغیر تاریخ مکمل نہیں ہوسکتی ہے۔

حالؔی کی نظموں میں جو تصویریں دیکھنے کو ملتی ہیں، وہ بے حد ہیبت ناک، دردناک اور کرب ناک ہوتے ہوئے بھی حقیقی اور سچی ہیں، ان کی صداقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے، ان میں ''ٹھہرے ہوئے پانی کی سچائی'' قطرہ کا مقدر، وعدہ، آخری دور، ایک کہانی، جزیرہ، لفظ، آواز اور صورت گری، نارسائی، انصاف واپسی، یہ بھی سچ وہ بھی سچ، آخری الزام، نشاں بھولی ہوئی منزل کا، وغیرہ کو سرفہرست رکھا جا سکتا ہے۔

علیم اللہ حالؔی اپنی شاعری میں جہاں اپنے دل کے درد و داغ کی باتیں کرتے ہیں، وہیں حیات و کائنات میں رونما ہونے والی تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ مختلف حادثات اور واقعات کو اپنے گہرے مطالعہ و مشاہدہ کی روشنی میں پیش کرتے ہیں، جن میں تنوع، رنگارنگی، تازگی، شگفتگی اور گہری بصیرت و بصارت کا خوبصورت انداز بھی کارفرما نظر آتا ہے۔

☆☆

Scanned by CamScanner

منور رانا

نام : سید منور علی

ولادت : ۲۶ر نومبر ۱۹۵۲ء (رائے بریلی)

نام والد : سید انور علی رانا

تعلیم : بی۔کام

مشغلہ : تجارت

شعری تصنیفات:

۱۔نیم کے پھول (شعری مجموعہ) ۱۹۹۳ء

۲۔کہو ظل الہٰی سے (شعری مجموعہ) ۲۰۰۰ء

۳۔ماں (شعری انتخاب) ۲۰۰۶ء

ھندی میں:

۱۔غزل گاؤں (۱۹۸۰ء) ۲۔پیپل چھاؤں (۱۹۸۵ء)

۳۔مور پاؤں (۱۹۸۹ء) ۴۔سب اسی کے لئے (۱۹۹۵ء)

۵۔بدن سرائے (۱۹۹۸ء) ۶۔ماں (۲۰۰۳ء)

۷۔گھر اکیلا ہو گیا (۲۰۰۴ء)

rekhta

Scanned by CamScanner

منور رانا: سفاک عہد کا معصوم شاعر

منور رانا کی شاعری اپنے دلکش پیرایۂ اظہار، موضوعات کا تنوع، گہری معنویت، تخلیقی حسن اور حیات و کائنات کے اسرار و رموز کو نئے ڈائمنشن (Dimension) عطا کرنے میں بے حد کامیاب ہے۔ منور رانا ایک حساس اور جذباتی شاعر ہیں، اس لئے ان کے اظہار و افکار میں جہاں ایک جانب عصری کشمکش کو انفرادیت بخشنے کا عمل نظر آتا ہے، وہیں دوسری طرف اپنے اسلاف اور تہذیبی اقدار کے چراغوں کو روشن رکھنے کی مثبت سعی بھی ملتی ہے۔ منور رانا، غریبوں، مزدوروں، بے کسوں کی آہ و فغاں کو بھی زبان دینے میں کامیاب ہیں۔

منور رانا کسی ازم کے اسیر نہیں، لیکن ان کے اشعار کی خصوصیات یہ ہیں کہ ترقی پسند ناقدین،، ان کی شاعری کا جائزہ لیں، تو ان سے بڑا ترقی پسند شاعر نظر نہیں آئے گا اس لئے کہ انہوں نے جس فکری و فنی التزام کے ساتھ غربت و افلاس کو موضوع سخن بنایا ہے، وہ آفاقیت کم شعرا کو میسر ہے۔ ٹھیک اسی طرح انہوں نے جدیدیت کے اجتہادی اثرات کو بھی اپنی غزلوں کے منظر نامے پر مرتب کیا ہے۔ ان کے مطالعے کے بعد جدیدیت کا بڑا سے بڑا علم بردار ناقد، انہیں جدید شعرا کی صف میں جگہ دینے میں اپنی پوری تنقیدی بصیرت صرف کر دے گا۔ اس سے ایک قدم مزید آگے بڑھایا جائے تو منور رانا، مابعد جدیدت کے ناقدین کو بھی مایوس نہیں کریں گے۔ اس لئے کہ موضوع، فکر، فن اور اظہار کے اعتبار سے ان کی شاعری مابعد جدیدیت کے میزان پر بھی بامراد ہوتی نظر آتی ہے۔

منور رانا کو سیدھے سادے الفاظ اور عام فہم انداز بیان سے براہ راست دل میں

Scanned by CamScanner

اتر جانے کا ہنر آتا ہے۔ان کی غزلیں جذبے کی صداقت، تخیل کی گہرائی، فکر کی ندرت اور معنویت کی وسعت سے معمور ہوتی ہیں ۔جن سے ان کی شعری اور فکری شناخت میں انفرادیت کی جھلک پوری آب و تاب کے ساتھ موجود ہے۔منور رانا کے اشعار سادگی میں پرکاری کی بہترین مثالیں ہیں۔انسانیت، معاشرت، فرد اور دنیا کی اعلیٰ قدروں سے منور رانا کی چونکہ گہری وابستگی ہے، اس لئے ان کے اشعار کا کینوس وسعت لئے ہوتا ہے۔منور رانا دوسرے بڑے اور نامور شعراء سے متاثر ضرور نظر آتے ہیں لیکن ان کی تقلید سے خود کو ہمیشہ پاک رکھنے کی سعی کی ہے۔اب سے بیس بائیس سال قبل میں نے منور کی شاعری کے متعلق لکھا تھا :

''اردو غزل بڑے کٹھن اور دشوار گزار راستے پر چل کر آج حیات و کائنات، اس کے اسرار و رموز اور پھر عصر حاضر کی تمام تر کربنا کیوں اور تلخیوں کو اپنے اندر سمو کر جدید اردو غزل کی شکل میں سامنے آئی۔ اور غالباً ایسی ہی جدید اردو غزل جس میں صرف حسن و عشق اور جام و سبو کے قصے نہ ہوں بلکہ زندگی اور اس کے عوامل کا خوبصورت اظہار ہو، کا تصور کلیم الدین احمد کے ذہن میں تھا۔

عہد حاضر میں ہر طرف خوف و ہراس ، درد و کرب ، گھٹن بے چہرگی، محرومی، بد حالی، استحصال کا بول بالا ہے۔ایسے ماحول سے شاعر کا جو عام لوگوں سے زیادہ حساس واقع ہوا ہے، متاثر ہونا فطری ہے۔

منور رانا عصر جدید کے ایسے ہونہار شاعر ہیں، جنہوں نے اپنے فکر وفن ، مطالعہ و مشاہدہ اور احساسات و جذبات کے خوبصورت اظہار سے بہت کم عرصے میں اپنی ایک پہچان بنا لی ہے۔مشہور شاعر والی عاصی نے اپنے اس شاگرد شاعر سے توقعات وابستہ کرتے ہوئے کہا تھا:

''جس شاعر کے یہاں غزل کی روایت سے بغاوت اتنے

Scanned by CamScanner

خوبصورت انداز میں ہو وہ ضرور آگے جائے گا اور نئی اردو غزل کو
بہت کچھ دے گا۔"

اور اس شاعر نے اپنی ذہانت و صلاحیت اور فکر و نظر سے یقینی طور پر نئی اردو غزل کو بہت کچھ دیا۔

منور رانا نے نہ صرف زمانے کے تغیرات کو قریب سے دیکھا ہے بلکہ جھیلا اور بھوگا ہے یہی وجہ ہے کہ ان کے اظہار میں اور ان کے خیال میں صداقت نظر آتی ہے۔ عصر حاضر کی کربنا کیوں، تلخیوں اور محرومیوں سے رانا بے حد متاثر نظر آتے ہیں۔ یہ تاثر ان کے اشعار میں نمایاں طور پر دکھائی دیتا ہے۔

منور رانا کا مطالعہ و مشاہدہ بڑا گہرا ہے۔ ان کی گرفت فن پر بھی مضبوط ہے۔ اس لئے رانا جو بھی شعر کہتے ہیں وہ فنی اور فکری لحاظ سے قابل قدر ہوتے ہیں۔ مخصوص اور منفرد لب و لہجہ والے اس شاعر کے یہاں علامتوں، استعاروں اور تشبیہوں کا استعمال بڑے سلیقے، خوبصورت اور دلکش و دلچسپ انداز میں نظر آتا ہے اور اہم بات یہ ہے کہ ان کے استعمال سے ترسیل یا ابہام کا مسئلہ پیدا نہیں ہوتا۔ بلکہ فہم و ادراک کے نئے نئے دروازے وا ہوتے ہیں۔

ان ہی خصوصیات کی بنا پر رانا کو ان کے ہم عصر شعرا مثلاً ناصر کاظمی، شکیب جلالی، کشور ناہید، سلطان اختر، پروین شاکر، ندا فاضلی اور ظفر اقبال کے درمیان بآسانی پہچانا جا سکتا ہے۔

چھوٹی بڑی بحروں میں منور رانا سیدھے سادے اور عام فہم لفظوں میں اتنی بڑی اور اہم باتیں کہہ جاتے ہیں کہ بعض اوقات فلسفہ کا گمان ہوتا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ رانا فلسفہ نہیں بلکہ حیات و کائنات اور اس کے اسرار و رموز کو پیش کرتے ہیں اور عصر حاضر کے سیاسی، سماجی اور معاشرتی تعفن پر بڑا گہرا طنز کرتے ہیں۔ رانا نے روایت سے یکسر بغاوت بھی نہیں کی ہے۔ بلکہ وہ اس سے رشتہ جوڑے ہوئے ہیں۔ جس کی وجہ کر ان کے یہاں روایت اور جدیدیت کا حسین امتزاج ملتا ہے۔ رانا آج بھی ماضی میں پناہ لینے کے ساتھ ساتھ بھولی بسری یادوں کے جہاں میں جی رہے ہیں۔ اس لئے کہ آج کے ہنگامی اور سیاسی دور میں حساس انسان کو ہر لمحہ ذہنی جھٹکوں سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔

Scanned by CamScanner

ایسے میں ماضی اور اس کی حسین یادیں ہی چند ساعتوں کے لئے درد و کرب سے بھری دنیا سے دور لے جاتی ہیں۔ رآنا کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

ہم گاؤں میں جب تک رہتے تھے یہ سب منظر مل جاتے تھے
دو چار کنویں مل جاتے تھے دس بیس شجر مل جاتے تھے

☆

ہم ایک تتلی کی خاطر بھٹکتے پھرتے تھے
کبھی نہ آئیں گے وہ دن شرارتوں والے

☆

حالات نے چہرے کی چمک چھین لی ورنہ
دو چار برس میں بڑھاپا نہیں آتا

☆

تو اب گاؤں سے رشتہ ہمارا ختم ہوتا ہے
پھر آنکھیں کھول لی جائیں کہ سپنا ختم ہوتا ہے

☆

عصر حاضر کی صعوبتوں، محرومیوں اور تلخیوں سے منور رآنا گھبراتے نہیں ہیں، بلکہ ان مصائب سے وہ مصالحت کرنے کی کوشش کرتے ہیں چونکہ عصر حاضر کے یہی انعام ہیں۔ اس لئے ان سے مصالحت اور سمجھوتہ ضروری ہے ورنہ آدمی گھٹ گھٹ کر مر جائے۔

☆

مسلسل دھوپ میں چلنے کا یہ انعام ہے رآنا
کہ اب پیڑوں کے سائے بھی برے معلوم ہوتے ہیں

☆

شجر اندر ہی اندر جل رہا ہے
مگر حسب ضرورت پھل رہا ہے

Scanned by CamScanner

سقراط جیسا شخص بھی جس کو نہ پی سکا
اس تلخیٔ حیات کو بھی ہم نے پی لیا

منور رانا کی غزلوں کا مطالعہ کرتے وقت بے اختیار خلیل الرحمٰن اعظمی کی ایک بات یاد آتی ہے۔ انھوں نے ایک جگہ لکھا تھا:

''جدید تر غزل کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اس غزل پر آپ کسی قسم کا لیبل نہیں لگا سکتے نہ کسی ایک صفت نہ کیفیت کے دائرے میں اسے مقید کر سکتے ہیں۔''

خلیل الرحمٰن کی بتائی ہوئی یہ خصوصیات منور رانا کی غزلوں میں نمایاں طور پر دیکھنے کو ملتی ہیں۔ منور رانا کسی ازم کے زیر اثر ہیں اور نہ فارمولا بند باتوں کو دہراتے ہیں۔ بلکہ ان کے یہاں موضوع کا تنوع ہے۔ اور شاعر جس عہد اور ماحول میں جی رہا ہے اس میں جو سیاسی اتھل پتھل ہے اس میں جو سماجی نابرابری ہے، معاشرتی اور تہذیبی خلا ہے اور ان سے پیدا ہونے والے جو عوامل ہیں ان پر شاعر کی بڑی گہری نگاہ ہے۔ شاعر ایسے حالات میں مختلف کیفیتوں سے دوچار ہوتا ہے جن کا اظہار اپنے مخصوص و منفرد لب و لہجہ میں خوبصورتی اور ایمانداری سے کرتا ہے۔

ہائے کتنی خوبصورت گالیاں دینے لگے
اب میرے احباب مجھ کو کرسیاں دینے لگے

☆

روتے ہوئے بچھڑنے کی فصلیں چلی گئیں
شہروں سے اب خلوص کی رسمیں چلی گئیں

☆

ہم نہ دلّی تھے نہ مزدور کی بیٹی لیکن
قافلے جو بھی ادھر آئے ہمیں لوٹ گئے

Scanned by CamScanner

بازار میں عجب کل ایک حادثہ ہوا
مزدور کے پسینے کو ریشم نے پی لیا

☆

نیا چراغ جلاتے ہیں جب بھی ہم رانا
ہمیں ہواؤں کے قصے سنائے جاتے ہیں

☆

سب کہتے ہیں یہ دیش ہمارا سونے کی ایک چڑیا ہے
اس بات کو وہ کیسے مانے جسے بھوکا سونا پڑتا ہے

☆

بہت زخمی تھے اس کے ہونٹ لیکن
وہ بچّہ مسکرانا چاہتا تھا

☆

منور رانا کے یہاں ایسے سیاسی، سماجی اور معاشرتی شعور کے ساتھ ساتھ حسن وعشق کی بھی نمایاں کارفرمائیاں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ جن میں تلخیوں کے ساتھ ساتھ تازگی اور شگفتگی بھی ہے۔ اور حسن وعشق کا گہرا تجربہ اور مشاہدہ بھی۔ رانا کے ایسے اشعار پڑھنے کے بعد محسوس ہوتا ہے کہ حسن وعشق کی یہ باتیں صرف سنی سنائی نہیں ہیں بلکہ رانا کے اپنے محسوسات ہیں۔

جب ان کا سامنا ہوا کچھ بھی نہ رہا یاد
ویسے کئی سوال میرے من میں آئے تھے

☆

تذکرہ تھا تیری آنکھوں کا سر بزم کہیں
اور مجھے میر کا دیوان بہت یاد آیا

☆

زخم ماضی کے مہکنے لگے گیسو کی طرح
اب تری یاد بھی آتی ہے تو خوشبو کی طرح

Scanned by CamScanner

منور راؔنا کے ایسے اشعار دل و دماغ کو متاثر کرنے کے ساتھ ساتھ حسن و عشق کی دنیا آباد کرتے ہیں۔ راناکے یہاں سادگی، نفاست اور عام فہم انداز پایا جاتا ہے جو انہیں منفرد اور قابل قدر بناتا ہے۔

منور راؔنا کی شاعری کے اس تنقیدی جائزے کے بعد منور راؔنا کی حالیہ شاعری کا مطالعہ کیا جائے، تو اندازہ ہوگا کہ منور رانا کی شاعری میں احساسات و جذبات کی جو چنگاریاں تھیں وہ آگ میں بدل گئی ہیں۔ ان کے لفظیات، کیفیات، تخیلات اور تفکرات میں مزید وسعت، ندرت اور گہرائی و گیرائی پیدا ہوئی ہے اور اتنے سارے Dimension سامنے آئے ہیں کہ کسی ایک مضمون میں ان تمام Dimension کو ضبط تحریر میں لانا ممکن نہیں، تو مشکل ضرور ہے، پھر بھی Dimension پر ایک نظر ڈالی جائے تو پہلا تاثر جو ابھرتا ہے، وہ یہ کہ منور راؔنا نے متوسط اور نچلے طبقہ کی سماجی، اقتصادی اور معاشرتی مسائل کے داخلی و خارجی کیفیات کو کافی اہمیت دی ہے۔ سیاسی سطح پر جو ناانصافی اور استحصال رونما ہو رہے ہیں، انہیں بھی اپنے منفرد لب و لہجہ اور بھرپور معنویت کے ساتھ پیش کیا ہے۔ چند اشعار دیکھئے ؂

یہیں رہوں گا کہیں عمر بھر نہ جاؤں گا
زمین ماں ہے اسے چھوڑ کر نہ جاؤں گا

میں مروں گا تو یہیں دفن کیا جاؤں گا
مری مٹی بھی کراچی نہیں جانے والی

شہرت ملی تو اس نے بھی لہجہ بدل دیا
دولت نے کتنے لوگوں کا شجرہ بدل دیا

گاؤں سے شہر کی طرف ہجرت اور اس کی کشمکش اور تصادم کو بھی منور راؔنا نے بہت قریب سے دیکھا اور شدّت سے محسوس کیا ہے۔ گاؤں کی ٹھہری ہوئی پر سکون زندگی میں جو محبت، اخوت، دوستی، یکجہتی، سادگی، نغمگی، شادابی اور سہانا پن ہے، وہ شہر کو میسر نہیں، شہر کی

Scanned by CamScanner

بھیڑ بھاڑ میں یہ سب جیسے گم ہو چکے ہیں ۔ یہاں اگر ہے تو مکر وفریب ، جبر وظلم ، استحصال ، ہوس ، تہذیبی و معاشرتی زوال ___ ان تصادم اور کشمکش کو منور رانا کی آنکھوں نے کس طرح دیکھا اور ان کے حساس دل و دماغ نے کس طرح محسوس کیا ، یہ منور رانا کے مشاہدے ، تجربے اور طریق اظہار کی دلآویز اور گوناگوں کیفیات سے لبریز شاعری میں بخوبی موجود ہے ۔

تمہارے شہر کی یہ رونقیں اچھی نہیں لگتیں
ہمیں جب گاؤں کے کچے گھروں کی یاد آتی ہے

☆

نیم کا پیڑ تھا ، برسات تھی اور جھولا تھا
گاؤں میں گزرا زمانہ بھی غزل جیسا تھا

☆

شہر میں آنے سے پہلے یہ کہاں معلوم تھا
بے حیائی میری آنکھوں کی حیا کھا جائے گی

☆

روتے ہوئے بچھڑنے کی فصلیں چلی گئیں
شہروں سے اب خلوص کی رسمیں چلی گئیں

☆

خدا کے واسطے اے بے ضمیری گاؤں مت آنا
یہاں بھی لوگ مرتے ہیں مگر کردار زندہ ہے

☆

تمہارے شہر میں رہنے کو ہم رہتے تو ہیں لیکن
کبھی ہم ٹوٹ جاتے ہیں کبھی گھر ٹوٹ جاتا ہے

☆

تمہارے شہر میں تاثیر سے خالی ہے یکجہتی
جہاں ہر روز دنگے ہوں وہاں گالی ہے یکجہتی

Scanned by CamScanner

منور رانا کی شاعری کا نمایاں عنصر یہ ہے کہ ان کی شاعری تصوراتی نہیں، بلکہ حقیقی اظہار کا نام ہے جن کا تانا بانا گہرے تجربے، عمیق مشاہدے اور فکر وفنی بصیرتوں کے ساتھ بُنا گیا ہے۔ منور رانا عصری زندگی میں اسلاف کی قدر و منزلت کا احساس کرانے کے ساتھ ساتھ زوال پذیر تہذیبی روایات اور اقدار کی پامالی پر بھی اپنی برہمی کا یوں اظہار کرتے ہیں۔

ہمیں گرتی ہوئی دیوار کو تھامے رہے ورنہ
سلیقے سے بزرگوں کی نشانی کون رکھتا ہے

☆

نئے کمروں میں اب چیزیں پرانی کون رکھتا ہے
پرندوں کے لئے شہروں میں پانی کون رکھتا ہے

☆

میرے بزرگوں کا سایہ تھا جب تلک مجھ پر
میں اپنی عمر سے چھوٹا دکھائی دیتا تھا

☆

باپ کی دولت سے یوں دونوں نے حصہ لے لیا
بھائی نے دستار لے لی، میں نے جوتا لے لیا

☆

منور رانا نے اپنی شاعری میں ماں کی عظمت، ممتا اور ایثار کو جو آفاقیت بخشی ہے، وہ منور رانا کا خاصہ ہے۔ ماں کو منور رانا کتنے روپ میں دیکھتے ہیں اور اس کی عظمت اور قدر و منزلت کو اپنے منفرد اور موثر انداز میں بیان کرتے ہیں، اس کا مطالعہ ہر قاری کو احساس کی وادیوں کی سیر کراتا ہے۔

دعائیں ماں کی پہنچانے کو میلوں میل جاتی ہیں
کہ جب پردیس جانے کے لئے بیٹا نکلتا ہے

Scanned by CamScanner

کھانے کی چیز ماں نے جو بھیجی ہیں گاؤں سے
باسی بھی ہوگئی ہیں تو لذت وہی رہی

☆

کچھ نہیں ہوگا تو آنچل میں چھپا لیگی مجھے
ماں کبھی سر پہ کھلی چھت نہیں رہنے دے گی

☆

شہر کی سڑکیں ہوں چاہے گاؤں کی پگڈنڈیاں
ماں کی انگلی تھام کر چلنا بہت اچھا لگا

☆

سر پھرے لوگ ہمیں دشمن جاں کہتے ہیں
ہم جو اس ملک کی مٹی کو بھی ماں کہتے ہیں

یہ تمام اشعار ایسے ہیں جو بے اختیار ماں کی عظمت اور اس کے ایثار کی قندیلیں روشن کر دیتے ہیں۔

ٹھیک اسی طرح بہن اور بیٹی، خاص طور پر ایک غریب کی بہن اور بیٹی کے سلسلے میں منور راناؔ کے جو احساسات و جذبات ہیں، وہ بالکل مختلف اور منفرد ہیں۔ یہ چند اشعار اس کی واضح مثالیں ہیں۔

وہ اپنے گھر میں روشن ساری شمعیں گنتا رہتا ہے
اکیلا بھائی خاموشی سے بہنیں گنتا رہتا ہے

☆

بس اسی احساس کی شدت نے بوڑھا کر دیا
ٹوٹے پھوٹے گھر میں اک لڑکی سیانی اور ہے

☆

رو رہے تھے سب تو میں بھی پھوٹ کر رونے لگا
ورنہ مجھ کو بیٹیوں کی رخصتی اچھی لگی

Scanned by CamScanner

ایک مفلس باپ یا بھائی کے لئے جوان کنواری لڑکی کی رخصتی کا تصور کس قدر پر کیف ہوتا ہے، اس درد و کرب لیکن انبساط کی اس کیفیت سے ہر غریب باپ بھائی گزرنا چاہتا ہے۔ کس خوبصورتی اور فنکارانہ رمق کے ساتھ منور رانا نے اس کا اظہار کیا ہے۔ بیٹی کی رخصتی پر روتے تو ہیں، لیکن بیٹی کی رخصتی انہیں اچھی لگتی ہے۔

منور رانا کا محبوب موضوع غربت و افلاس سے کراہتی زندگی بھی ہے۔ انہوں نے غربت دیکھی ہے اور بھوگا بھی ہے، اس لئے ان سے بہتر اور سچا اظہار کون کرسکتا ہے۔ مزدوروں اور غریبوں کے درد و کرب، غم و آلائش کو منور رانا نے کتنی معنویت بخشی ہے۔ یہ دیکھئے۔

ہمیں بھی پیٹ کی خاطر خزانہ ڈھونڈ لینا ہے
اسی پھینکے ہوئے کھانے سے دانہ ڈھونڈ لینا ہے

☆

اس درجہ مصائب میں جلا ہوں
اب کوئی بھی موسم ہو پسینہ نہیں آتا

☆

خوش رہتا ہے وہ اپنی غریبی میں ہمیشہ
رانا کبھی شاہوں کی غلامی نہیں کرتا

☆

تم اس کی لاش کو دیکھو نہ یوں حقارت سے
یہ شخص پہلے امیروں کے گھر بناتا تھا

☆

بھٹکتی ہے ہوس دن رات سونے کی دکانوں میں
غریبی کان چھدواتی ہے، تنکا ڈال دیتی ہے

☆

ہماری مفلسی پر آپ کو ہنسنا مبارک ہو
مگر یہ طنز ہر سید گھرانے تک پہنچتا ہے

Scanned by CamScanner

ضرورت مجھ کو سمجھوتے پہ آمادہ تو کرتی ہے
مجھے ہاتھوں کو پھیلاتے مگر اچھا نہیں لگتا

☆

دہلیز پہ سر کھولے کھڑی ہوگی ضرورت
اب ایسے میں گھر جانا مناسب نہیں ہوگا

☆

ہم پرندوں کی طرح صبح سے دانے کے لئے
گھر سے چل پڑتے ہیں کچھ پیسے کمانے کے لئے

☆

سو جاتے ہیں فٹ پاتھ پہ اخبار بچھا کر
مزدور کبھی نیند کی گولی نہیں کھاتے

☆

اس دورِ ترقی میں بھی مفلس کی جوانی
بھٹی میں سلگتے ہوئے ایندھن کی طرح

☆

خوش حالی میں سب ہوتے ہیں اونچی ذات
بھوکے ننگے لوگ ہریجن ہو جاتے ہیں

☆

یہ تمام اشعار مفلسوں، غریبوں اور مزدوروں کی گھٹن بھری زندگی کی عکاسی کے ساتھ ساتھ ضمیر اور اقدار کو بچائے رکھنے کا اظہار بھی ہے ایسی درد والم میں ڈوبی ہوئی شاعری، منہ میں سونے کا چمچ لئے پیدا ہونے والے یا ایئر کنڈیشنڈ روم میں بیٹھ کر ممکن ہے۔ ایسی شاعری وہی کر سکتا ہے جس نے غریبی اور مفلسی کو بہت قریب سے دیکھا ہے۔

منور رانا کے یہاں زندگی کی تلخ حقیقتوں کا اظہار وافکار لطیف پیرایہ میں اور رواں دواں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ منور رانا کی زبان، دل کی کیفیات وجذبات سے ہم آہنگ ہے۔

Scanned by CamScanner

منور رانا نے اپنی شاعری میں فلسفہ حیات کو مختلف زاویوں سے پیش کیا ہے اور اس امر کا خیال رکھا ہے کہ فلسفۂ حیات کے اظہار میں اشعار اپنی رمزیت، شعریت، کیفیت اور معنویت کو نہ کھودے۔

زندگی کی تلخ حقیقتوں کے اظہار میں منور رانا اس قدر ڈوبے ہوئے ہیں کہ بعض اوقات ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان کی جمالیاتی حس دب گئی ہے۔ لیکن کبھی اس کا اظہار کیا تو سینکڑوں اشعار پر بھاری پڑتے نظر آتے ہیں۔ اس ضمن میں صرف دو شعر پر نظر ٹھہرتی ہے۔ دیکھئے ان میں کس قدر شدت اور حدت ہے۔

وہ میرے ہونٹوں پہ رکھتا ہے پھول سی آنکھیں
خبر اڑاؤ کہ رانا شراب پیتا ہے

☆

وہ بھی کیا دن تھے تیرے پاؤں کی آہٹ بن کر
دل کا سینے میں دھڑکنا بھی غزل جیسا تھا

☆

منور رانا عہد حاضر کا ایک بے حد حساس، بے باک جذباتی اور منفرد شاعر ہے اور بے شک اس نے اپنے شعری اظہار و افکار کے لئے لفظوں کو برتنے میں لہو تھوک دیا ہے اور یہ اسی لہو تھوکنے کا ثمرہ ہے کہ منور رانا کا تقریباً ہر شعر ایک مجسم تصویر بن کر ہمارے سامنے کھڑا ہے۔

میں نے لفظوں کو برتنے میں لہو تھوک دیا
آپ تو صرف یہ دیکھیں گے غزل کیسی ہے

☆

میں تجھ کو شعر سنانا تو چاہتا ہوں مگر
تمام شعر غزل کے ہیں مرثیے کی طرح

Scanned by CamScanner

ساجدہ زیدی

نام : ساجدہ زیدی

تخلص : ساجدہؔ

ولادت : ۱۸؍مئی ۱۹۲۷ء (میرٹھ، یوپی)

نام والد : سید مستحسن زیدی

تعلیم : ایم۔فِل (لندن یونیورسیٹی)

مشغلہ : درس وتدریس

شعری تصنیفات:

۱۔ جوئے نغمہ (شعری مجموعہ) ۱۹۶۲ء

۲۔ آتش سیال (شعری مجموعہ)

۳۔ سیل وجود (شعری مجموعہ)

rekhta

Scanned by CamScanner

ساجدہ زیدی کی نظم نگاری

اُردو شاعری میں خواتین کی خدمات سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔لیکن افسانوی ادب میں جس طرح عصمت چغتائی اور قرۃ العین حیدر وغیرہ نے کئی حد بندیوں، بندشوں اور روایتوں کو توڑ کر ساج کے مختلف طبقہ اور مسائل پر لکھا، اور ڈوب کر لکھا۔شاعری میں ایسی مثالیں کم ہی ملتی ہیں۔مشاعروں میں شاعرات اپنی خوبصورت آواز اور حسین چہرے کی وجہ کر واہ واہی لے لیتی ہیں۔لیکن معیاری، ادبی رسالوں میں واہ واہی لینے والی شاعرات شاذ و نادر ہی دیکھنے کو ملتی ہیں۔ایسے ہی شاذونادر شاعرات میں ساجدہ زیدی اپنے منفرد انداز بیان کی وجہ کر جانی پہچانی اور پسند کی جاتی ہیں۔

ساجدہ زیدی نہ صرف اردو شاعری میں خواتین کی بھر پور نمائندگی کر رہی ہیں بلکہ معیاری اردو شاعری خصوصاً اپنی نظموں میں اپنے گہرے مطالعے، عمیق مشاہدے کے ساتھ نئی سمت، نیا لب و لہجہ اور زندگی کے فلسفہ حیات کو پر وقار انداز میں پیش کیا ہے اور اپنے احساسات وجذبات کے منفرد رنگ و آہنگ کو برقرار رکھتے ہوئے حیات و کائنات کے سربستہ راز کی گتھیوں کو سلجھانے کی کوشش کی ہے۔اور اس عمل میں وہ سوالات کے گرداب میں ڈوبتی چلی گئیں اور زندگی کی ٹھاٹھیں مارتے سمندر سے تشنہ لب لوٹتی ہیں۔ساجدہ زیدی ہستی اور نیستی میں فرق کو جاننے کے لئے مسلسل سنگلاخ راستوں پر چلتی رہیں، لیکن راستے دھندلکے میں گم ہوتے چلے گئے۔وہ لکھتی ہیں:

> ''انسان اور کائنات کے تعلق سے ہزاروں سوالات میرے ذہن میں اٹھتے ہیں۔خوابوں کی تلاش میں فلسفہ، مذہب، نفسیات، ادب، شاعری آرٹ اور انسانی ربط و تعلق کے پیچیدہ راستوں میں

Scanned by CamScanner

سرگرداں رہی ہوں لیکن جوں جوں انجانے راستوں پر آگے بڑھتی ہوں، دھند لکے بڑھتے ہیں۔ سوالات کے گرداب بڑھتے ہیں اور خوابوں کی پرسکون پُر یقین روشنی نے دامن بچایا ہے۔ انسانی زندگی، سماجی مسائل اور کائناتی عوامل سے متعلق ہزاروں گتھیوں کو میں نے ذات کے وسیلے سے سلجھانے کی کوشش کی۔ لیکن ذات خود کیا ہے؟ وہ بھی کوئی مفرد و معطل اکائی نہیں۔ بلکہ ایک راز سر بستہ ہے جو اسی تلاش کا ایک حصہ ہے۔ شاید میری تمام زندگی تلاش ذات اور تلاش معنی کائنات میں سوالات اٹھانے ہی کا نام ہے۔''
(آتش سیال۔ ص۔ ۱۰-۹)

ساجدہ زیدی چونکہ زندگی، ذات اور مسائل سے نبرد آزما رہی ہیں اس لئے تجربات کی بھٹی میں تپ کر جو احساس و جذبات شاعری کی شکل میں ڈھلے وہ شاعری کے سنگ میل بن گئے۔ کچھ نمونے دیکھئے

''یہ سیال آتش ہے
کہ جس کے بے بحر ساحل میں
جو یاں ڈوب جاتی ہیں
زمانے جذب ہو جاتے ہیں
اور لمحوں کی زنجیر مسلسل ٹوٹ جاتی ہیں۔''
(آتش سیال)

''کبھی لگتا ہے
میرے چاروں جانب بے کراں اندھیرا ہے
میں لاکھوں سال سے ہوں غوطہ زن
تنہائیوں، تاریکیوں کے ایک بے پایاں سمندر میں
یہ سارے فلسفے، یہ آگہی اور فکر کے رشتے
یہ تہذیب و تمدّن کے بلند آہنگ ہنگامے

Scanned by CamScanner

مذاہب اور سیاست کی فسوں کاری
یہ سب مجذوب کی بڑ ہیں
یہ ساری کائنات اک وہم ہے۔''

(وجدان)

''کہ تم بھی اس راہ کے مسافر ہو
جس کی، قدموں نے میرے چھانی ہے خاک برسوں
کہ تم نے بھی آبلوں سے پاؤں کے، ریت میں گل کھلائے اکثر
کہ تم نے بھی ریگ زار پائے سراب کے پیچھے پیچھے چل کر
وہ چند پتھر جو میں نے پگھلائے ہیں حقیقت کی بھٹیوں میں
تمہارا بھی ان سے کوئی رشتہ ہے تم بھی ایسے ہی چند پتھر
خود اپنی فکر رسا کے آتش کدہ میں پگھلا رہے ہو شاید۔''

(سلیمان ادیب کے نام)

ان نظموں کے چند بند اس بات کے غماز ہیں کہ ساجدہ زیدی نے زندگی کے گہرے سمندر میں غوطہ لگایا ہے، اور جو کچھ دیکھا سمجھا انہیں اپنے گہرے فکر و احساس کے ساتھ نظم کی شکل میں تمام فنی لوازمات کے ساتھ پیش کر دیا ہے۔

ساجدہ زیدی کی شاعری کی ابتدا ۱۹۵۵ء سے ہوئی اور ۱۹۶۲ء میں ان کا پہلا شعری مجموعہ ''جوئے نغمہ'' منظر عام پر آیا۔ جس میں ان کے ابتدائی چار سال کا انتخاب تھا۔ اس مجموعہ کی نظموں میں ساجدہ زیدی کے ابتدائی نقوش کے ساتھ، سقراط سے کیر کے گارو، نطشے، ینگ اور سارتر تک دستیوسکی اور چیخوف سے کامیو، کافکا، بیکٹ اور ٹیٹیکو تک، مائیکل انجلو اور لیونارڈو ڈاونچی سے روداں، نہری مور اور مودکلیانی تک، میر و غالب اور انیس سے قرۃ العین حیدر تک کی فکری وابستگی بھی نمایاں ہیں۔ لیکن آہستہ آہستہ ساجدہ نے خود اپنی راہ بنائی اور ''سیل وجود'' اور اس سے آگے بڑھ کر اپنی پہچان بھی کرائی۔ انھوں نے فلسفہ میں ڈوبی زندگی اور احوال و کوائف کا خوب صورت اظہار اپنی نظموں میں بڑے مؤثر انداز میں کر، اپنی راہ خود متعین کی۔

ساجدہ زیدی کو ناقدوں سے شکایت ہے کہ ان کے قلم سے کبھی ساجدہ زیدی کا نام

Scanned by CamScanner

نہیں نکلا۔ اس کی ایک وجہ تو خود انہوں نے بیان کی ہے۔ ''بازار شہرت میں آنے کے لئے جو قیمت چکانی پڑتی ہے وہ میں ادا نہیں کر سکی۔'' اور دوسری وجہ جو میرے خیال میں ہے وہ ہے ساجدہ زیدی کی نظموں میں فلسفہ ہی فلسفہ اور اس کا بوجھل پن اور تیسری وجہ متذکرہ بالا مشاہیر کے فلسفیانہ خیالات کا اسیر رہنا ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ زندگی خود ایک فلسفہ ہے لیکن اس فلسفہ کو زندگی کی تمام تر رنگینیوں اور رعنائیوں کے ساتھ دیکھا جا سکتا ہے۔ اس کے مسائل کو سمجھایا جا سکتا ہے۔ ساجدہ زیدی نے فلسفہ کی اسیری سے ''سیل وجود'' تک پہنچتے پہنچتے نکلنے کی کوشش کی ہے۔ اور شام، احتساب، درس غم، انکشاف، کھڑکی، یہ نہ میری کہانی، خاموش گفتگو، ایک نظم، جہنم سے آگے، تسلسل یا جمود، کوئی دریچہ کھولو، سناٹے کی آواز، ایک سوال، ہستی کا المیہ اور لندن کی ایک رات'' وغیرہ جیسی نظمیں حیات وکائنات کے فلسفہ میں ڈوبی معرکۃ الآرا نظموں کے ساتھ ہی ساتھ آمادگی، وہ پل، یہ گھڑی، تماشا میرے آگے [illegible] منظر، سمندر کے سینے کے خاموش اسرار، ایک نظم، شب چراغ، خواب کے گرداب، اُمید، رقص درد کی، وغیرہ جیسی شاندار اور موثر نظمیں کہی ہیں جو اردو نظم نگاری کی بے حد مختصر سی فہرست میں اضافہ کی حیثیت رکھتی ہیں اور بے شک اردو نظم نگاری کو ایک خاص معیار اور وقار بخشتی ہیں۔

Scanned by CamScanner

شاهد جمیل

نام : شاہد جمیل احمد

تخلص : شاہدؔ

ولادت : ۱۵رجنوری ۱۹۵۶ء (ڈہری اون سون، روہتاس، بہار)

نام والد : الحاج عبدالجلیل

تعلیم : بی۔ایس سی، (مگدھ یونیورسیٹی)

مشغلہ : محکمہ ریوینو، بہار میں افسر

شعری تصنیفات :

۱۔خوابوں کے ہمسائے (شعری مجموعہ) ۱۹۹۲ء

۲۔سوماہیے (ماہیوں کا مجموعہ) ۲۰۰۲ء

۳۔دوہارنگ (دوہے کا انتخاب) ۲۰۰۳ء

۴۔عکس اندر عکس (کہہ مکرنیوں کا مجموعہ) ۲۰۰۳ء

rekhta

Scanned by CamScanner

شاہد جمیل: خوابوں کا شاعر

شاہد جمیل، گزشتہ تقریباً تین دہائیوں سے اردو شاعری کی تپتی ریت پر سفر کر رہے ہیں اور ان کا یہ سفر جاری و ساری ہے۔ ان تین دہائیوں کے سفر میں انہوں نے نہ جانے وقت کے کتنے تیور، حالات کی سنگینیوں اور حادثات کے تصادم کو دیکھا اور شدت سے محسوس کیا ہے۔

اس دوران اردو شاعری بھی کئی تجرباتی دور سے گزری اور اس کے اسلوب اور تجربات میں نہ صرف نمایاں تبدیلی آئی، بلکہ اس کے تفکرات اور تصورات بھی بدلے۔

پوری تین دہائی تک اپنے فکر و فن سے شاعری کو سجاتے سنوارتے ہوئے اسلوب کی ندرت، موضوعات کے تنوع اور احساسات و جذبات کی گہرائی، گیرائی کو نمایاں اور منفرد بنانے کی کوشش ہی شاہد جمیل کی شاعرانہ عظمت کی دلیل ہے۔ ورنہ ہمارے بعض شاعر عہد طفلی میں ہی اتنے بلند بانگ دعوے پیش کرنے لگتے ہیں کہ ان کے سامنے پوری شاعری ہی بے معنی نظر آنے لگتی ہے۔ ایسے عمل اور بیان سے شاہد جمیل نے گریز کرتے ہوئے بڑے اعتماد اور حوصلہ کے ساتھ ایسے ایسے خوبصورت اور فکر و فلسفہ سے معمور اشعار پیش کئے کہ لوگ چونک پڑے اور محمود ہاشمی یہ کہنے پر مجبور ہوئے کہ :

> ''شاہد جمیل جدید تر نسل کے تازہ کار رویّے اور طرز فکر کے نمائندہ شاعر ہیں۔ ان کا مجموعہ ''خوابوں کے ہم سائے'' پڑھنے والوں کو چونکائے گا اور دیر تک سوچنے اور محسوس کرتے رہنے پر مجبور کرے گا۔''

محمود ہاشمی کی یہ رائے شاہد جمیل کے ان اشعار کی روشنی میں سامنے آئی جو فکری، فنی اور

Scanned by CamScanner

موضوعات ومواد کے لحاظ سے بڑے موثر اور مستحکم انداز میں پیش ہوئے، مثلاً یہ اشعار:

میرے سر سے جو بھی گزرا سانحہ کچھ بھی نہ تھا
یا زمانے سے ابھی میں آشنا کچھ بھی نہ تھا

☆

میں آنے والی بہاروں میں کتنا شامل تھا
جو زرد پتے تھے، ان پر مرا بچھونا تھا

☆

انا کی جنگ، خرد کا کھنڈر، جنوں کے چراغ
میں اس محاذ پہ سب کچھ لٹانے والا ہوں

☆

دل وہ پتھر ہے جو ہر موج سہا کرتا ہے
غم وہ ندی ہے جو ہر وقت بھری رہتی ہے

☆

کبھی ہنسی، کبھی آنسو، کبھی غبار ہوں میں
مجھے کھنگالو کہ جذبوں کا ریگ زار ہوں میں

یہ اشعار اس امر کی جانب اشارہ کرتے ہیں کہ شاہد جمیل نے حیات وکائنات کے اسرار ورموز کا بغور مطالعہ ومشاہدہ کیا ہے۔ جسے اپنے مخصوص لب ولہجہ میں، داخلی وخارجی کرب اور احساسات وجذبات کے ساتھ پیش کر کے وہ اپنے فن کو اعلیٰ مقام عطا کرتے ہیں۔

شاہد جمیل جس وقت اردو شاعری میں متعارف ہوئے، اس وقت ترقی پسند تحریک کا سیلاب تھم چکا تھا اور جدیدیت شباب پر تھی اور نئے تجربات کے نام پر ایسے ایسے نمونے سامنے آئے:

مزاجِ حسن ہے ظاہر میں ٹھنڈا
سلگتا ہے مگر بھوبھل میں انڈا
(سلیم احمد)

Scanned by CamScanner

جیسی شاعری نے اردو شاعری کے حسن و معنویت کو نہ صرف مجروح اور مسخ کیا بلکہ اس کی افہام و تفہیم بھی مسئلہ بنی جس سے اس کی مقبولیت ختم ہونے لگی۔ کہا جاتا ہے کہ شاعری اپنے زمانے اور عہد کا آئینہ ہوتی ہے۔ لیکن تقلیدی اور نام نہاد جدیدیت نے اردو شاعری کو اپنے عہد، سماج، زمانہ اور اجتماعیت سے دور کر کے انفرادی خول میں سمیٹ کر، اسے صرف ذاتی کرب، گھٹن اور خوف تک محدود کر دیا اور شعوری طور پر علامتوں، استعاروں اور تشبیہوں کے سہارے گنجلک اور لایعنی بنا دیا۔ اس حد تک کہ جو شاعری جتنی مبہم اور فہم و ادراک سے دور ہو، اتنی ہی کامیاب قرار دی جانے لگی۔ ایسی کوششوں سے اردو شاعری پر گہن لگنا فطری تھا، لیکن نئی نسل کے تازہ دم شعرا کی فکری و فنی کاوشوں سے آہستہ آہستہ گہن ختم ہونے لگا اور پھر دھیرے دھیرے یہ خوشگوار تبدیلی جن نوجوان شعرا کی وجہ کر ممکن ہو سکی، ان میں شاہد جمیل کا نام کئی لحاظ سے معتبر اور اہم ہے۔ شاہد جمیل نے اپنے تجربات اور محسوسات کو ایک خاص زاویۂ نگاہ کے ساتھ اور پوری توانائی، اعتماد اور وقار کے ساتھ پیش کرنے کی جسارت اس انداز سے کی ہے:

دُھواں، غبار، لہو، پیاس، کچھ تو لیتے جاؤ
ہمارے شہر سے لَوٹوگے اور خالی ہاتھ؟

☆

میں تو شاعر ہوں، مرا کام جھلتے رہنا
اوس کی بوند ترا نام سہی، یاد نہ آ

☆

اب تم کو یہاں کوئی بھی آواز نہ دے گا
ہر شخص تمہاری ہی طرح ٹوٹ چکا ہے!

☆

تم ویسے بھی ٹوٹنے سے رہا کرتے ہو شاہدؔ
باہر نہ ابھی نکلو، بہت تیز ہوا ہے

Scanned by CamScanner

ایسے خوبصورت اور فکر انگیز اشعار شاہد جمیل نے کہہ کر یقیناً شعری دنیا کو چونکا دیا ہے، جس کے بارے میں تبصرہ کرتے ہوئے بدر اورنگ آبادی لکھتے ہیں:

گزشتہ چند برسوں میں جن شعرا نے شعری دنیا کو چونکایا ہے، ان میں شاہد جمیل کا نام نمایاں ہے۔ نظم و غزل، دونوں اصناف میں معنویت کی گہرائی، انداز بیان کا انوکھا رنگ، الفاظ کے صوتیاتی حسن اور موضوع کا پورا منظر نامہ یکساں طور پر نظر آتا ہے۔ اس لیے یہ فیصلہ کرنے کی ضرورت ہی نہیں رہ جاتی کہ شاہد جمیل 'بنیادی طور پر' غزل کا شاعر ہے یا نظم کا۔" (زبان و ادب، پٹنہ)

یہ حقیقت ہے کہ شاہد جمیل جس عہد میں سانس لے رہے ہیں، ان میں بارود اور جلتے ہوئے انسانی جسم کی بو چہار جانب فضا میں پھیلی ہوئی ہے۔ اور زندہ رہنے کے لئے سانس لینا ضروری ہے اس لئے فضا میں رچی بسی اس بو کو بھی شاہد جمیل اپنے اندر جذب کر لینے پر مجبور اور اس کے بعد ان کا داخلی درد و کرب اس طرح سامنے آتا ہے کہ ان کا ایک ایک شعر تخلیقیت اور معنویت کا نمونہ قرار پاتا ہے:

حادثے یوں نہ متحد ہوتے
یہ سفر قسط وار کرنا تھا

☆

غم سے بے لاگ جو مسرور رہا برسوں تلک
زندگی آج وہی پھول سا چہرہ مانگے

☆

زندگی کے موسم کو ڈھونڈتے ہیں سڑکوں پر
خود سے بے خبر ہیں، کچھ نئے نئے چہرے

☆

Scanned by CamScanner

ہر چہرہ سلگتے ہوئے قطروں میں بٹا ہے
ہم سب کو سمندر سا کوئی لوٹ رہا ہے

زندگی کی الناکیاں، کرب، گھٹن اور درد میں ڈوبی صدا یقیناً یہ آج کے بیمار عہد کا اشاریہ ہیں، جن سے ہر شخص نبرد آزما ہے۔ شاہد جمیل ایک حساس شاعر ہیں، اس لیے انہوں نے ان کیفیات کو بڑے واضح اور منفرد انداز کے ساتھ بیان کیا ہے جس سے متاثر ہو کر شمس الرحمٰن فاروقی بھی یہ کہنے پر مجبور ہوئے کہ :

''آپ کا کلام عمدہ ہے۔ اس میں ایک وقار، تفکر اور ٹھہراؤ ہے، جو آپ جیسے کم عمر شاعر کے لئے لائق افتخار ہے۔''

کچھ اسی انداز سے گوپی چند نارنگ بھی شاہد جمیل کی شعری عظمت کا اعتراف کرتے ہیں، وہ لکھتے ہیں:

''آپ کی تازگیِ فکر اور تراش کا قائل ہوں۔''

جدید نسل کے کسی شاعر کے لئے ایسا تنقیدی اظہار ایک اعزاز ہے اور اس کی عظمت کی دلیل ہے۔ ورنہ ان دنوں جس طرح کی شاعری سامنے آ رہی ہے، انھیں دیکھ کر مایوسیوں کا احساس زیادہ ہوتا ہے، اس لئے کہ عہد جدید کے زیادہ تر شعراء کا مطالعہ و مشاہدہ محدود ہے اور فکر و خیال میں وہ بلندی نہیں جو شاعری کو بامراد اور باوقار بناتی ہے۔

شاہد جمیل کی شاعری اس لحاظ سے بھی اہمیت کی حامل ہے کہ اپنے ہم عصر شعراء کے درمیان انھوں نے اپنی منفرد پہچان بنائی ہے اور لوگوں کے ذہن پر یہ احساس مرتسم کرنے میں کامیاب ہیں کہ ان کی شاعری سلگتے ہوئے خوابوں کی عبارتوں کی ترجمان ہے اور حیات و کائنات کا بیان بھی۔ ہر حساس شاعر کی طرح وہ بھی خوابوں کو سجاتے اور سنوارتے ہیں۔ ان خوابوں میں کبھی کونپلیں پھوٹتی دکھائی دیتی ہیں اور کبھی وہ انہیں جھلستے ہوئے بھی دیکھتے ہیں۔ ایسے خوابوں سے وہ متفکر بھی ہوتے ہیں اور ہراساں بھی۔ وہ خوشی اور انبساط کی کیفیتوں سے سرشار بھی ہوتے ہیں اور روشن جگنوؤں اور رنگ برنگی تتلیوں کو پکڑنے کی بھی کوشش کرتے ہیں، جو دراصل مسرت و محبت اور حسن و عشق کی

Scanned by CamScanner

علامتیں بن کر جلوہ گر ہوتی ہیں۔ شاہد جمیل اپنے گہرے تنقیدی شعور، تخلیقی بصیرت، فکری و فنی آگہی کو اپنے مخصوص لب و لہجہ اور اسلوب کے ساتھ شعری پیکر میں ڈھال کر نہ صرف اپنے عہد کا منظر نامہ پیش کرتے ہیں، بلکہ آنے والے لمحوں کی آہٹ کی بھی نشاندہی کرتے ہیں :

لب سراب بے زاری، چشم خواب سے عاری
کس قدر ادھورے ہیں یہ سجے سجے چہرے

☆

میں اِک رات ہر رات بے خواب
تو اک خواب ہر دم سنہرا

☆

سفید خواب، خواب کی سحر سفید
دھنک ہوئی سیاہ، بحر و بر سفید

☆

اس خواب اور خواب کی تعبیر کو دیکھنے، سمجھنے اور سمجھانے والا شاعر زندگی اور اس کی حقیقتوں کا کس قدر نباض ہے، اس کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اس سیاق و سباق میں بلراج کومل کی یہ رائے بڑی اہمیت کی حامل ہے، وہ لکھتے ہیں:

> ''عہد بیمار کے شکوہ گزار ہونے کے باوجود شاہد جمیل خوابوں کے بحران، خوابوں کی تلاش، یادوں کی رعنائی، سمندر کی زرخیز لیکن گمشدہ آوارگی، واضح اور غیر واضح رشتوں کی وابستگی، مائلِ اضطراب تنہائی اور متکلم پر خطر گوشہ نشینی کا ایک ایسا منظر نامہ پیش کرتے ہیں جس میں بیک وقت کئی غیر محفوظ، متضاد، متصادم عناصر سرگرم عمل ہیں۔
>
> نظم اور غزل دونوں اصناف میں انتخاب موضوعات و الفاظ، مصرعوں کی نشست و برخاست، لب و لہجے کی تازگی اور ندرت،

Scanned by CamScanner

قافیے کے فنکارانہ استعمال کی صوتیاتی سحر کاری ان کے کلام کی
امتیازی خصوصیات میں سے چند قابل ذکر خصوصیات ہیں۔ شاہد
جمیل کی شاعری، مشاہدے، تجربے اور طریقۂ اظہار کی دلآویز اور
گوناگوں کیفیات کی شاعری ہے۔''

(''خوابوں کے ہم سائے'' کے فلیپ سے)

شاہد جمیل عصر حاضر کا ایک نمائندہ شاعر ہے، جس کی آواز اور افکار منفرد ہیں، جس کی
سوچ اور خیالات کی پرواز آنے والے کل کا اشاریہ ہے۔

rekhta

Scanned by CamScanner

شہپر رسول

نام : چودھری وجیہہ الدین
قلمی نام: شہپر رسول
تخلص : شہپرؔ
ولادت : ۱۹۵۶ء (بچھرواںواں، ضلع مرادآباد)
نام والد: رئیس الدین وارثی
تعلیم : ایم۔اے (اردو) پی۔ایچ۔ڈی
مشغلہ : درس وتدریس (جامعہ یونیورسیٹی، نئی دہلی)
شعری تصنیفات:

۱۔صدف سمندر (شعری مجموعہ) ۱۹۸۸ء
۲۔سخن سراب (شعری مجموعہ) ۲۰۰۰ء

Scanned by CamScanner

شہپر رسول: عصر حاضر کا بے باک شاعر

شہپر رسول کی اب تک جتنی بھی غزلیں میری نظروں سے گزری ہیں ان کے مطالعے سے میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ شہپر رسول کے مشاہدے میں جو بات آتی ہے اسے بڑی خوبصورتی سے فکری و فنی لوازمات کے ساتھ پیش کرتے ہیں شہپر رسول جس عہد میں زندگی گزار رہے ہیں اس عہد میں ہر طرف خوف و ہراس، درد و کرب، گھٹن، ناامیدی، محرومی، بے چینی، بے کیفی، بے چہرگی، استحصال اور تلخیوں کا ماحول ہے۔ جن کا اظہار شہپر رسول کی غزلوں میں بڑے موثر انداز میں جدید اور مخصوص لب و لہجہ کے ساتھ ملتا ہے۔ اپنے گہرے مطالعے و مشاہدے اور فکر و آگہی کو شعری پیکر میں شہپر رسول اس طرح ڈھالتے ہیں کہ ان میں معنویت کی تہہ داری کے ساتھ ساتھ تازگی اور شگفتگی کا احساس ہوتا ہے یہی وہ خصوصیات ہیں جن کی وجہ کر شہپر رسول نے اپنے تمام ہم عصر شعرا کے درمیان اپنی پہچان بنانے کے ساتھ ساتھ اپنی انفرادی شان بھی برقرار رکھی ہے۔

غزل گوئی پر شہپر رسول نے خصوصی طور پر توجہ دی ہے اور اس صنف پر گرفت مضبوط رکھنے کی وجہ کر شہپر رسول کی غزلیں فنی طور پر بھی اہمیت کی حامل ہیں۔

غزل کے بارے میں مختلف لوگوں کی مختلف رائے ہے۔ لیکن سبھی یہ ماننے پر مجبور ہیں کہ غزل ایک ایسی صنف ہے، جس سے پوری اردو شاعری کی پہچان بنتی ہے۔ کلیم الدین احمد نے غزل کو نیم وحشی صنف شاعری کے ساتھ ساتھ یہ بھی کہنے سے خود کو نہیں روک پائے کہ ''شاعری

Scanned by CamScanner

فنون لطیفہ میں اولین مرتبہ رکھتی ہے۔'' اور ''غزل اردو شاعری کی جان ہے''۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اردو غزل بڑی کٹھن اور دشوار گزار مراحل طئے کر آج حیات و کائنات اس کے اسرار و رموز اور عصر حاضر کی تلخیوں اور کربنا کیوں کو اپنے اندر سمو کر جدید اردو غزل کی شکل میں ہمارے سامنے اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ سامنے ہے، غالبًا ایسی ہی جدید اردو غزل کا تصور جس میں حسن و عشق اور جام و صبو کے قصے نہ ہوں بلکہ زندگی اور اس کے عوامل کا خوبصورت اظہار ہو، کلیم الدین احمد کے ذہن میں بھی تھا۔

غزلوں میں صرف احساسات و جذبات کا اظہار ہو۔ یہ کوئی اہم بات نہیں۔ اہم بات یہ ہے کہ شاعر کے احساسات و جذبات و تخیلات میں زندگی اور اس کے اسرار و رموز کا کس قدر دخل ہے، کتنی صداقت اور کتنی موزونیت ہے، یہ بات زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔

اس تناظر میں شہپر رسول کی شاعری کا ہم تنقیدی جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں احساس ہوتا ہے کہ شہپر رسول نے اپنی غزلوں میں اپنے عہد اور ماحول کی عکاسی بڑے بھرپور اور موثر طریقے سے کی ہے۔ انامیت، تنہائی، محرومی، یاس، استحصال، مایوسی، گھٹن، کرب، تہذیب کا زوال، رشتوں کا بکھراؤ، تشدد، ظلم، بے یقینی، عدم تحفظ، ہجرت اور بے حسی ایسی تلخ حقیقتیں ہیں، جن سے عصر حاضر کے لوگوں کا کبھی نہ کسی طرح سامنا ہے۔ شہپر رسول نے ان تلخ حقیقتوں سے آنکھیں ملائی ہیں، اور اپنی غزلوں میں ان عوامل کا اظہار فکری معنویت اور فنی کیفیتوں کے ساتھ کیا ہے۔ چند اشعار دیکھئے ۔

رشتوں کا احترام کرے گا تو اس کے بعد
کچھ دن کو اپنے سارے عزیزوں سے کٹ کے دیکھ

☆

تیرا بھی دل دکھائے گا میرا اکیلا پن
تنہائیوں کی بھیڑ میں خود سے لپٹ کے دیکھ

☆

وقت نے القاب بخشے ہیں مجھے
بے اماں ، بے سائباں ، بے گھر اداس

Scanned by CamScanner

ذکر تھا اجداد کے اوصاف کا
ہوگیا پل بھر میں گھر کا گھر اداس

☆

طائرِ غم کیوں قطار اندر قطار آنے لگے
درد کی سوکھی ندی پھر ہوگئی لبریز کیوں

☆

زیر کچھ بونے مجھے کیسے کردیں
ان حقیروں کی مدد کر اے خدا

☆

مجھے بھی لمحۂ ہجرت نے کردیا تقسیم
نگاہ گھر کی طرف ہے، قدم سفر کی طرف

☆

شہپرؔ صدائے وقت سے کرلو مصالحت
محرومیوں کے در پہ کوئی کیوں پڑا رہے

☆

روز بے مقصد خوش آمد قتل کرتی ہے
روز مرجاتا ہے وہ اپنی انا کے سامنے

☆

ہمارے ہاتھ بھی بے جاں نہ تھے مگر شہپرؔ
ہوا کے ہاتھ نے ہم سے چراغ چھین لیا

☆

مشکلیں آسانیاں گڈ مڈ ہوئیں ایسی کہ ہم
مشکلوں کے رنگ میں راحت چرالائے بہت

rekhta

Scanned by CamScanner

معاہدہ ہو چکا دکھوں سے نباہنے کا
تو پھر محاذوں پہ آنسوؤں کی سپاہ کیوں ہے

شہپر رسول عصر حاضر کی کربنا کیوں اور تلخیوں کو سنجیدگی اور سچائیوں کے ساتھ پیش کرنے میں نہ صرف کامیاب ہیں بلکہ فکری اور فنی بالیدگی کی وجہ کر شہپر رسول کے اشعار اردو غزل کے معیار اور وقار میں اضافہ کرتے ہیں۔ شہپر رسول کی ایک اہم خصوصیت یہ بھی ہے کہ انھوں نے روایت سے یکسر بغاوت نہیں کی ہے، بلکہ ان کی غزلوں میں ایک طرف جہاں جدیدیت اور اس کے تقاضوں کا بھر پور احساس ہے، وہیں روایت کا احترام بھی ملتا ہے، جس کے نتیجے میں شہپر رسول کی غزلوں میں جدیدیت اور روایت کا حسین امتزاج کا پرتو جھلکتا ہے۔ جدیدیت کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے شہپر رسول علامتوں، استعاروں اور تشبیہوں کو اس خوبصورتی سے استعمال کرتے ہیں کہ وہ ان کے اشعار کا ایک اہم حصہ بن جاتے ہیں اور ان کی حیثیت جز ولاینفک کی ہو جاتی ہے۔ چند اشعار دیکھئے۔

دیکھے گی کوئی آنکھ یہ منظر کہاں تلک
پھیلا ہوا ہے کالا سمندر کہاں تلک

☆

سورج کو کوئی فرض نہیں ہے یہ دیکھنا
جاتی ہے دھوپ چھت سے اتر کر کہاں تلک

☆

کوئی چلے بھی ہاتھوں میں آنکھیں لئے ہوئے
تاریک راستوں کے سفر پر کہاں تلک

یہ تمام اشعار ایسے ہیں، جن میں اشارے کنائے بڑے خوبصورت التزام کے ساتھ موجود ہیں۔ منفرد اور مخصوص لب ولہجہ میں اپنے عہد کی تلخیوں اور کربنا کیوں کا اظہار جس شوخی اور شگفتگی کے ساتھ شہپر رسول کرتے ہیں وہ ہمیں شہپر رسولؔ کی شعری عظمت کا اعتراف کرنے پر مجبور کرتے ہیں۔ فکری اور فنی اعتبار سے بھی چونکہ شہپر رسول کے یہاں انفرادیت پائی جاتی

Scanned by CamScanner

ہے اس لئے کہا جا سکتا ہے کہ شہپر رسول عہد جدید کے ایک نمائندہ شاعر ہیں اپنی انفرادیت کو برقرار رکھنے کے ساتھ ساتھ شہپر رسول تقلید سے بھی پرہیز کرتے ہیں۔

شہپر رسول اپنی غزلوں میں سنی سنائی باتوں کو پیش نہیں کرتے بلکہ اپنی سوچ اور فکر کو بڑے اعتماد، اعتبار اور پروقار طریقے سے کسی کی تقلید کے بغیر پیش کرنے پر قدرت رکھتے ہیں۔ یہی اعتماد اور اعتبار انھیں اپنے ہم عصروں سے منفرد اور ممتاز بناتے ہیں۔

Scanned by CamScanner

سید احمد قادری کی تنقید نگاری پر چند مشاہیر کی رائے

ڈاکٹر عبدالمغنی

تنقیدی مضمون نگاری یقیناً ایک مشکل فن ہے اور آج باضابطہ تنقیدی مطالعات بہت ہی کم کئے جا رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بالعموم ادبی رسائل میں تنقیدی مقالات کا حصہ کم یا کمزور ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے سید احمد قادری صاحب کی کاوشیں قابلِ داد ہیں۔

ڈاکٹر وہاب اشرفی

تنقید نگاری کا کام خاصا صبر آزما ہے۔ بہت کم افراد ایسے ہیں، جن کی تنقیدی بصیرت تسلیم کی جا سکی ہے۔ سید احمد قادری جو کچھ لکھ رہے ہیں، سوچ سمجھ کر لکھ رہے ہیں۔ اسی لئے رائے زنی میں ان کے یہاں خاص احتیاط پائی جاتی ہے۔ یہی احتیاط انہیں اچھے نقادوں کی صف میں لاتی ہے۔

ڈاکٹر علیم اللہ حالی

سید احمد قادری اپنی تنقید میں تخلیق کی روح تک پہونچنے کی کوشش کرتے ہیں۔ روح کی گہرائیوں میں اترتے ہوئے عام طور پر نقاد حضرات گھبراتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ تنقید تخلیق سے بے تعلق ہو کر رہ جاتی ہے۔ میں تنقید کو اس حد تک تکنیکی سمجھنے کو تیار نہیں، جہاں نقاد، فنکار کے فن پاروں کو خارجی تجزیہ کے ذریعہ سمجھنا چاہتا ہے۔ سید احمد قادری غیر تکنیکی و غیر رسمی انداز کے فارمولے اور ڈھانچے میں مقید ہوئے بغیر آزاد فضا میں شعر و ادب کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اپنی تنقید کو وہ اس بصیرت اور کشاد سے گراں مایہ بنانے کی کوشش کرتے ہیں، جو ہمیں فنکار تک رسائی میں مدد پہونچاتی ہے۔ قادری عہد نو کے تقاضوں کو بھی سمجھتے ہیں اور تاثرات کو بھی۔ اس طرح انہیں شعور و احساس کی دو چند دولت ملی ہوئی ہے۔

ڈاکٹر عبدالمنان

سید احمد قادری اپنے خیالات کو ناقدانہ پیرائے میں پیش کرتے ہیں۔ بعض فقرے چبھتے ہوئے ہوتے ہیں، مختصر لفظوں میں تجزیاتی عمل کا فن قادری کو باوقار اور مقبول بناتا ہے۔

Scanned by CamScanner

SHAIR AUR SHAIREE

(Criticism)

by : *Dr. Syed Ahmad Quadri*

Scanned by CamScanner